

کیشلاش

سفرنامہ

ملک اشفاق

کیلاش

سفرنامہ

ملک اشفاق

بھگے ہوئے پروں سے ہی پرواز کر کے دیکھ

سورج غروب ہو چکا تھا۔ فضا میں خشکی بڑھ چکی تھی اور بخ بستہ تیز ہوا چل رہی تھی۔ دریائے کنہار شور کرتا ہوا جوش و خروش سے بہہ رہا تھا۔ سیف الملوک جھیل کا نظارہ کر کے سیاح واپس لوٹ رہے تھے سیف الملوک جھیل سے نکلنے والا نالہ ناروں کے مقام پر آ کر دریائے کنہار میں شامل ہو جاتا ہے اور خوبصورت سنگم بناتا ہے۔ ایک آسٹریلوی سیاح پھٹی پتلون میلی سی جیکٹ پہنے اور ہاتھ میں قیمتی کیمرہ لئے میرے پاس آ کر بیٹھ جاتا ہے مجھے ”ہیلو“ کہتا ہے اور کوئی انگریزی گانا گنگنا رہا ہے۔ میری طرف دیکھ کر مسکراتا ہے اور شمال کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے ”کل میں چترال جا رہا ہوں۔ چترال بڑی خوبصورت اور دلکش جگہ ہے اور کیلاش وادیاں پوری دنیا میں انوکھے رسم و رواج اور ثقافت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ مجھ سے پوچھتا ہے کیا آپ نے کیلاش وادیاں دیکھی ہیں؟“

میں نے کہا ”نہیں“

اور اتنے میں شرارتی لڑکوں کا ایک گروپ آ کر ہمارے قریب بیٹھ گیا اور وہ لڑکے آپس میں سیف الملوک کی خیالی پروں کے بارے میں بڑی گستاخانہ گفتگو کرنے لگے۔ لیکن ان میں سے ایک باوقار اور سنجیدہ سالڑکا ”السلام علیکم“ کہہ کر اور اجازت لے کر ہمارے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا ”کہاں سے آئے ہیں؟“ اس نے بتایا کہ ہم کراچی یونیورسٹی میں ایم اے ”تاریخ“ کے طالب علم ہیں۔ ہم نے تمام شمالی علاقہ جات دیکھ لئے ہیں اب کل واپس جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کیا آپ نے چترال اور کیلاش وادیاں بھی دیکھی ہیں؟ کہنے لگا ”ہاں“ اور اس نے تفصیلی طور پر ان وادیوں کے بارے میں ہمیں بتایا اور ایک ایڈریس دیا جو کہ ایک کیلاش لڑکے کا تھا کہ اس سے مل کر آپ تمام وادیوں کی خوب سیر کر سکتے ہیں۔

اس کا نام ”شیر عالم“ ہے نویں جماعت کا طالب علم ہے ”برون“ گاؤں میں رہتا ہے بہت اچھا اور ملنسار لڑکا ہے یہ آپ کو گائیڈ بھی کرے گا۔

کاغان اور ناران کی سیاحت سے واپس آ کر میں نے شیر عالم نامی اس کیلاش لڑکے کو خط لکھا جس کا جواب چند دنوں کے بعد آیا۔ اس طرح اس قلمی دوست نے ہمیں وادی بمبورت آنے کی دعوت دی اور ہر طرح کی راہنمائی کا وعدہ کیا۔

اس طرح عبدالصمد صاحب کراچی والے کا دیا ہوا ایڈریس کارآمد ثابت ہوا جس کا میں تہہ دل سے مشکور ہوں۔ عبدالصمد

صاحب سے بہت عرصہ نیاز حاصل رہا لیکن پھر ایسا رابطہ منقطع ہوا کہ ان سے دوبارہ رابطہ نہ ہو سکا۔

ایک تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم کیلاش کی وادی بمبورت میں پہنچے اور شیر عالم کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ہمارا یہ ٹور اتنا کامیاب رہا لیکن اس سے ہمیں بہت سے فوائد حاصل ہوئے کہ ہم شیر عالم کے علاوہ اور بھی بہت سے دوست بنانے میں کامیاب رہے اور کیلاش وادیوں کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ لیکن وقت اور پیسے کی کمی کے باعث جلد ہی لوٹ آئے۔ یہ جولائی کے دن تھے اور وادی میں ملکی اور غیر ملکی سیاح ایک بڑی تعداد میں آئے ہوئے تھے مہنگائی عروج پر تھی اور ہماری جیبیں خالی تھیں۔ شیر عالم کے ساتھ ہم وعدہ کر کے آئے تھے کہ ہم دسمبر میں آپ کا سب سے بڑا تہوار ”چاؤ موس“ دیکھنے ضرور آئیں گے اس لئے وعدے کے مطابق اپنے سیاحت کلب کے تمام ممبران سمیت یعنی محمد اشرف کھوکھر فدا محمد چوہدری اور ناصر صاحب کے ساتھ وادی کیلاش کا سرمائی تہوار دیکھنے کے لئے عازم سفر ہوئے۔

چترال ایر پورٹ پر ہوائی جہاز ایک جھٹکے سے زمین کے سینے پر پنچے گاڑ کر دور تک پھسلتا چلا گیا۔ تمام مسافر اپنی اپنی حفاظتی پیٹیاں کھول کر اپنا دستی سامان سنبھالتے ہوئے دروازے کی جانب چلے۔ جونہی جہاز کے دروازے سے نکل کر سیر بھی پر قدم رکھا تو کوہ ہندہ کش کی بخ بستہ ہواؤں نے بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔

دھوپ تو خوب چمک رہی تھی مگر صرف چمک ہی رہی تھی۔ کوہ ہندو کش کی بخ بستہ سرکش ہواؤں نے دھوپ کی نمازت کو شکست دے کر اپنی برتری قائم کر رکھی تھی۔ گرم کپڑے سویٹر جیکٹ اور نہ جانے کیا کیا پہن رکھا تھا پھر بھی ہوا پسلیوں میں گھسکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ پوری وادی پہ ایک سکوت سا چھایا ہوا تھا۔ ماحول میں صرف چنچل ہوا کے رقص کو ہی محسوس کیا جاسکتا تھا یا پھر چٹیل پہاڑوں کی دوسری جانب برف کا لباس پہنے ”ترتھیر“ کی مغرور چوٹی کو دیکھا جاسکتا تھا۔

”جہاز“ کے زیادہ تر مسافر مقامی ہی تھے۔ چال ڈھال بول چال اور مخصوص پہناوے کے علاوہ چہروں پر معصومیت کا غلبہ تھا۔ صرف چار مسافر چینی یا جاپانی قسم کے تھے اور ایک انگریز عورت اکیلی گلابی رنگ کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھی اور آنکھوں پر گہرے شیشوں کا چشمہ اور باریک سا ڈوپٹہ وہ تو تیز اور سرد ہوا میں یوں چل رہی تھی جیسے موسم بہار میں باد نسیم کے جھونکوں سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔

ناصر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”یار یہ تو ولایتی ہے یہ تو میری اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی میں تو اسے دیکھی سمجھتا رہا؟“ میں نے کہا ”ناصر جی اگر جہاز میں آپ کو پتہ چل جاتا کہ محترمہ ولایتی ہیں تو پھر آپ کیا کرتے؟ یار کرنا کیا تھا؟ یہ احساس تو ہوتا کہ ہم

بھی انگریزوں سے کم نہیں ہیں میں نے کہا اب کر لو احساس“ کہنے لگا نہیں اب وہ بات نہیں۔ یہ عجیب و غریب فلسفہ تو میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ اتنے میں ہم لاؤنج میں پہنچ گئے لیکن سرد ہوا سے پھر بھی چھٹکارا نہ ملا۔ لاؤنج کیا تھا بس ایک جھونپڑی سی تھی صرف لکڑی کا فریم سا کھڑا تھا اور ٹین کی چھت تھی اور کھڑکیاں دروازے ندارد کیونکہ یہ ابھی زیر تعمیر تھا۔

چھپر نما لاؤنج سے اپنا اپنا سامان اٹھا کر باہر آئے تو بیشتر لوگ اپنے سامان کی گٹھریاں بغلوں میں دبائے اپنے گھر کی جانب جانے والی پگڈنڈیوں پر جا رہے تھے وہ حسینہ فرنگ اور چینی جاپانی قسم کے لوگوں کے لئے نئی نئی گڑی پہلے سے آئی ہوئی تھی وہ بھی چلے گئے۔ اب صرف ہم چار کا ٹولہ تھا۔ بج ہوا کی سائیں سائیں تھی اور پرے ایک پک اپ وگن کا ڈرائیور کھڑا ہماری حرکات و سکنات کا غیر محسوس انداز میں جائزہ لے رہا تھا۔ ہم اپنا سامان اٹھا کر اس جاسوس نما ڈرائیور کے پاس چلے گئے۔

اس نے طائرانہ نظر سے ہمارا جائزہ لیا اور پھر ترجمیر کی سفید چوٹی کو تکتے لگا جیسے اس نے پہلے بار دیکھی ہو۔ اور پھر دیکھتا ہی رہا۔ ہم چاروں نے کورس کے انداز میں کہا جناب شہر چلو گے اس نے کہا ”آں ناہیں“

اشرف سمجھا شاید نہ جانے کے بارے میں کہہ رہا ہے کہ نہیں جاؤں گا۔ ہم نے منت سماجت کر کے آخر اسے منایا لیا۔ جب وہ ٹیڑھی میڑھی سڑک پر ہوا کی رفتار سے پک اپ دوڑانے لگا تو چوہدری فدا کہنے لگا ”اس سے پوچھو کہ یہ ہمیں اغوا کر کے تو نہیں لے جا رہا۔ میں نے بارہا چلا چلا کر ڈرائیور صاحب سے کہا جناب آہستہ چلیں لیکن ”مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر“ کے مصداق نظر آنے لگا۔

بہر حال ہم ڈکوڈو لے کھاتے بلکہ ہضم کرتے چترال کے مین بازار میں اتر گئے۔ چوہدری فدا اور ناصرتو بہت ہی مایوس نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگے ”یہ آپ کا چترال تو دیکھ لیا کیا اسی لیے جان لیوا سردی میں اتنا لمبا سفر ہمیں کروایا تھا اس سے تو بہتر تھا کہ بھائی پھیرو یا پھر چچو کی ملیاں دیکھ لیتے۔ کم از کم وہاں پیبیاں بندے تو ہوتے۔“

بازار میں کوئی خاص رونق نہ تھی بس دوکاندار تھے اور دکانیں اور چند ایک دائیں بائیں پھرنے والے افغان مہاجر جو گرم چشمہ کی سرحد پار کر کے ادھر چترال میں دو تہائی کاروبار پہ چھائے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس فی آدمی دو بیگ کے حساب سے سامان تھا یعنی کل آٹھ عدد بیگ وہ بھی بھاری بھر کم۔

چوہدری فدا اور ناصرتو نے باقاعدہ احتجاج کرنا شروع کر دیا آخر اس شدید موسم میں ہمیں اس اجازت اور بیابان میں کیوں لایا گیا ہے میں نے کہا؟ بھائی میرے یہ ہماری منزل نہیں ہے ابھی تو ہمیں تین گھنٹے مسلسل سفر کرتے ہوئے مزید آگے جانا ہے تو چوہدری فدا

فرمانے لگے تو پھر کیا ہوگا؟ ”جب یہاں اتنا سناٹا اور بے رونقی ہے حالانکہ یہ ضلع کا صدر مقام بھی ہے تو اس سے آگے کا خدا ہی حافظ ہے“

”اشفاق صاحب! دراصل آپ ہمیں چترال اور کیلاش وادیوں کی خوبصورتی کے من گھڑت اور جھوٹے قصے سنانا کر گمراہ کرتے رہے ہیں اور اس طرح آپ نے شوق آوارگی میں ہمیں بھی خوار کیا“ میں تو خاموش رہا البتہ اشرف نے ان کو قائل کرنے کی کوشش کی کیونکہ جو اپوزیشن بن چکی تھی یعنی چوہدری فدا اور ناصر اور موخر الذکر اشرف صاحب کے سالار صاحب بھی تھے اس لئے اشرف کافی دباؤ میں بھی تھا۔

اب اپوزیشن کا مطالبہ تھا کہ کھانے کا بندوبست کیا جائے جبکہ جام مربیہ ڈبل روٹی اور اچار وغیرہ تو ہمارے پاس وافر مقدار میں تھا۔ لیکن فدا اور ناصر نے کھانے سے انکار کر دیا۔ جیسے حضرت موسیٰ کی قوم نے من و سلویٰ کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ بالکل انہوں نے بھی ایسا ہی مطالبہ کر کے کہا کہ ہم تو ترکیاری اور روٹی کھائیں گے۔ میں تو سامان کی رکھوالی کے لئے بیٹھ گیا ورموسیٰ کی قوم ترکیاری روٹی کی تلاش میں مختصر سے بازار میں چلی گئی

تھوڑی دیر کے بعد تینوں واپس لوٹے اور سامان اٹھا کر اپنے دریافت شدہ ریسٹورنٹ کی جانب چلے میں بھی پیچھے ہو لیا۔ ریسٹورنٹ کیا تھا بس ہمارے میلوں ٹھیلوں میں جیسے کچی ناکی ہوتی ہے بالکل ویسا ہی اندھیرا اس تنبو کے اندر چھایا ہوا تھا۔ اس ریسٹورنٹ کا نام ”بدخشاں ریسٹورنٹ“ تھا لیکن اندر ایک بڑا لمبا سا تخت تھا جس پر پھولدار پلاسٹک بچھا ہوا تھا اور کونے میں ایک نوجوان افغان گندے کپڑے اور ٹوپی پہنے بیٹھا تھا اور نیلی کچور آنکھوں سے ڈبرڈر ہمیں گھورے جا رہا تھا۔

اور پھر تین اور افغان جو کافی صحت مند تھے چادروں کی بکلیں مارے اندر داخل ہوئے۔ فدا چوہدری اور ناصر بالکل سہم کر رہ گئے۔ اشرف اور میں بھی ڈر گئے نہ جانے ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں لیکن جب وہ جب تمام آپس میں گفتگو کرنے لگے تو معلوم ہوا کہ وہ ریسٹورنٹ کے ”ویٹر“ (Waiter) وغیرہ ہیں۔ اتنے بٹے کئے خوفناک اور ابھی ہوئی داڑھیوں والے ویٹر میں نے کہیں اور نہیں دیکھے۔ تو اچانک ناصر کہنے لگا بھئی وہ اپنا اسلحہ وغیرہ تو بیگوں میں ہی ہے ناں! دراصل وہ ان افغانوں کو سنانا چاہتا تھا کہ ہمارے پاس بھی خطرناک قسم کا اسلحہ ہے جو کہ ہمارے پاس بالکل نہ تھا۔ اس ٹورنگ ٹاکیڑ نما ریسٹورنٹ میں ہم چار عدد گاہک تھے لیکن وہ کوئی توجہ ہی نہیں کر رہے تھے۔ ہم نے پوچھا ”کھانے کے لئے کچھ ہے“

وہ منبر قسم کا افغان جو ککڑ میں بکھل مارے بیٹھا تھا کہنے لگا

”سب کچھ ہے سب کچھ“

ہمیں چوتھے پر بٹھا دیا گیا اور پھر وہ سب افغان ہمیں سرو (Serve) کرنے لگے۔ ہمارے بتائے بغیر ہی ہمارے سامنے دور سے کھڑے کھڑے ایک ایک چوتھائی روٹی پھینک دی اور بڑے بڑے ایلو منیم کے پیالوں میں ایک ایک بڑا سا ہڈ اور شور بہ ڈال کر رکھ دیا۔ ہاں رکھ دیا کیونکہ وہ یہ پھینک نہیں سکتے تھے اور ایک ایک پلیٹ چاول۔ ہم نے کہا ”ہم یہ گوشت نہیں کھائیں گے“ وہ کہنے لگے ”کیوں نہیں کھائیں گے یہ کھانا پڑے گا۔“

ہم حیران تھے کیوں کھانا پڑے گا۔ جبکہ اشرف نے یہ فتویٰ جاری کر دیا تھا کہ یہ گوشت حلال جانوروں میں سے کسی کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس نے ہر پیالے میں پڑے ہوئے ہڈوں کا بغور مشاہدہ کیا تھا نہ وہ اور نہ ہم سمجھ سکے تھے کہ کون سے جانور کا ہڈ ہو سکتا ہے۔ البتہ ان تمام افغانوں نے جب گھور کر اجتماعی طور پر ہمیں دیکھا تو ہم نے چاول پر شور بہ ڈال کر بغیر چمچوں کے کھانا شروع کر دیا کیونکہ ان کے کچھر میں چمچہ کسی چیز کا نام نہیں۔ بل (Bill) ادا کر کے باہر آئے تو بھوک ویسے ہی تھی البتہ اپوزیشن کا احتجاج ختم ہو چکا تھا اب ہم ایک جیپ میں ایون جا رہے تھے ایون چترال کے مضافات میں ہے ایک مقام ہے یہ دریائے چترال کے کنارے ایک خوبصورت گاؤں ہے اور اس کے ساتھ دیر سے آنے والی سڑک گزرتی ہے۔ ایون چترال سے تقریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر شمال کی جانب ہے کیونکہ تمام کیلاش وادیوں کو جانے کے لئے ایون ہی سے جانا پڑتا ہے اس لئے یہ سیاحوں کے لئے ایک مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہماری جیپ (Jeep) میں ایک امام مسجد صاحب اور ایک سکول ماسٹر صاحب بھی سوار تھے۔ امام مسجد صاحب تو خاصے روکھے سے انسان تھے لیکن ماسٹر صاحب بہت ہی بااخلاق آدمی تھے ہم سے ضد کرنے لگے دیکھو! رات ہو جائے گی آپ میرے پاس ایون میں ٹھہریں آپ کے لئے آگ جلاؤں گا، کھانا بناؤں گا اور چترال کی خاص چیز پنیر بھی کھلاؤں گا۔ آپ صبح سویرے چلے جانا، مولوی صاحب تو باقاعدہ ہم سے ناراض تھے کہ آپ لوگ خواہنا وہ ان کافر لوگوں کے پاس جا رہے ہیں۔ لیکن ماسٹر صاحب روایتی چترالیوں کی طرح اپنی مہمان نوازی اور اخلاق کا مظاہرہ کر رہے تھے ان کا کہنا تھا کہ انسان کو سیر و سیاحت سے اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہئے۔ اتنے میں ہم ایون پہنچ گئے چھوٹے چھوٹے گھر وندوں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور بازار بالکل سنسان پڑا ہوا تھا۔ صرف ایک دکان کھلی ہوئی تھی جس سے کچھ لوگ سودا سلف خرید رہے تھے۔ جیپ کو بس یہیں تک ہی آنا تھا ہم ماسٹر صاحب کا شکر یہ ادا کر کے اتر گئے۔ بازار کی جو واحد دکان کھلی ہوئی تھی ابھی ہم اس کا رخ کر ہی رہے تھے کہ شیر عالم دکان میں سے دوڑتا ہوا آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

”تین دن سے آپکو مسلسل ایئر پورٹ لینے کے لئے جانا رہا ہوں لیکن کوئی جہاز ہی نہیں آیا آج بھی میں ایئر پورٹ سے آیا ہوں کیونکہ آپ کی فلائیٹ ہی نہ آئی تھی اس لئے مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا تو کچھ دوست مل گئے اور اب ہم اس دوکان سے کچھ سامان خرید رہے تھے کیونکہ کل شام سے ہمارا جشن شروع ہو رہا ہے۔ چلو اچھا ہوا آپ آگئے اب مزہ آئے گا۔

شیر عالم کے اسرار پر ہی ہم ان کے جشن چاؤ موس کو دیکھنے کے لئے آئے تھے ورنہ اس کڑا کے کی سردی میں جبکہ دسمبر کی سردی اپنے عروج پر ہو اور دس دس فٹ برف سے راستے ڈھکے ہوئے ہوں تو اس جنگل بیاباں میں کون آتا ہے۔ دراصل کیلاش لوگوں کا یہ جشن خاص کر جاپان اور یورپی سیاحوں کے لیے ایک خواب ہے وہ چاؤ موس کے راز جاننا چاہتے ہیں اور ہم چاروں شاید پہلے پاکستانی تھے جو ان کا جشن دیکھنے کے لئے جا رہے تھے۔ دنیا کی یہ انوکھی قوم عجیب و غریب رسموں اور رازوں کی وجہ سے ابھی تک معمہ بنی ہوئی ہے۔ جس کا تصور کر کے ہی میرے رونگھٹے کھڑے ہو رہے تھے کیونکہ اشرف کھوکھر اور میں پہلے بھی یہ راستہ آزما چکے تھے لیکن اس وقت کچھ اور بات تھی کیونکہ گرمیوں میں راستہ اس موسم کی بھست بہت اچھا ہوتا ہے لیکن اب اسی سڑک پر بے انتہا برف پڑ چکی تھی اور ماحول بھی سردی اور شام کی وجہ سے کافی ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ ایون سے دو کلومیٹر ہی دور گئے تھے کہ ایک عمومی بلندی اور تنگ ساموڑ آ گیا جب ناصر اور فدا کو بتایا کہ یہ وہ سڑک ہے جس پر ہم چند لمحوں بعد اوپر جائیں گے تو دونوں نے خوف زدہ ہو کر ہماری جانب دیکھا اور پوچھا کہ وہ کیسے لیکن جب واقعی جیپ عمودی بلندی کی طرف مڑی تو دونوں صاحبان کو ”کیسے“ کا جواب مل گیا اور ملتا ہی گیا۔

بعض جگہ تو سڑک اتنی تنگ ہے کہ ایک پیدل چلتے آدمی کو بھی پاس کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا اور کئی جگہ سے سڑک کے اوپر بڑی بڑی چٹانیں شید کی طرح بچھی ہوئی تھیں اور آدمی جیپ میں اگر کھڑا ہو تو اس کا سر ان چٹانوں سے ٹکراتا ہے۔ دائیں طرف گہرائی میں شور مچاتا ہوا ندی کا صاف اور شفاف پانی اور بائیں جانب تیز نوکیلی چٹانیں نیچے تین تین فٹ برف جس سے جیپ بار بار پھسلتی تھی۔ فطرت اپنی اصلی حالت میں ہمارے چاروں طرف بکھری ہوئی تھی ندی کا بے کل پانی اٹھکھکیاں کرتا ہوا ناچتا گاتا تراؤں کی جانب رواں دواں تھا۔ ہمارے دائیں بائیں کی چوٹیاں برف کے غلاف میں لپیٹی ہوئی تھیں لیکن راستہ مشکل اور بے ڈھبہ ہونے کی وجہ سے جیپ صحیح طریقے سے نہیں چل رہی تھی۔ جیپ میں سوار تمام لوگ ان فطری اور خوبصورت نظاروں میں کوئی دلچسپی نہ لے رہے تھے بلکہ خوف و ہراس سے تمام لوگوں کے چہرے زرد ہو رہے تھے اس کٹھن سفر کے بعد وادی کیلاش کی وہ سرحدی چوکی آئی جہاں سے ایک راستہ دائیں جانب وادی رمبور کو اور بائیں جانب کا راستہ وادی بمبورت کو جاتا ہے یہاں یہ دونوں کا خوبصورت سنگم ہے جو رمبور اور بمبورت سے آتی ہیں۔ ان وادیوں میں جانے کے لئے اسی جگہ سے ٹیکس ادا کر کیلاش وادیوں میں جانے کے پر مٹ ملتا ہے

سورج مغرب کی سفید چوٹیوں میں دھندلا رہا تھا ہماری جیب بائیں جانب والی سڑک پر مڑ گئی یہ ایک نیا کٹھن راستہ تھا برف کی چاندی نے وادی کے حسن کو نکھار دیا تھا لیکن یہ راستہ ہمیں بالکل اجنبی سا معلوم ہو رہا تھا کیونکہ برف نے راستے کے خدو خال بدل دیئے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ہم وادی بمبورت کے بیرون گاؤں میں پہنچ گئے ہمارا سامان شیر عالم رحمت رحیم اور اس کے بھائی محمد رحیم نے جیب سے اتارا اور رحمت کے گھر کے مہمان خانے میں جا رکھا۔ مہمان خانہ جو کہ ایک چکور کمرہ لکڑی اور پتھروں سے بنا ہوا تھا۔ فرش پہ بڑی سی دری بچھا کر اس پہ صاف ستھرے بستر بچھا رکھے تھے۔ کمرے کے درمیان میں آتش دان تھا جس میں آگ جل رہی تھی گرم پانی سے ہمارے ہاتھ دھلائے گئے۔ گرم گرم تہوہ اور خشک میوؤں سے ہماری تواضع کی گئی۔ رحمت رحیم کے گھر والوں نے اس وقت ایک موٹا تازہ بکرا ذبح کیا اور اس کے کباب بنائے دیسی گھی کے پرائھے اور ساتھ پنیر بھی رکھا گیا یہ ہمارا رات کا کھانا تھا۔ کھانے کے بعد تازہ انگور پیش کئے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد گھر کے تمام افراد سے ہمارا تعارف کرایا گیا۔

گو کہ ہم ان کی زبان نہیں جانتے تھے لیکن انکے چہروں پہ خوشی کا تاثر اور میٹھی مسکراہٹیں بتا رہی تھیں کہ ہماری آمد ان کی خوشی کا باعث ہے۔ ان لوگوں کی مہمان نوازی کا لطف اس لئے بھی بہترین تھا کہ اس میں خلوص کی چاشنی تھی جب ہم سو رہے تھے تو اگر آتش دان میں آگ ٹھنڈی پڑتی تو گھر کا کوئی نہ کوئی فرد اپنا گرم لحاف چھوڑ کر ہمارے کمرے کے آتش دان میں لکڑیاں پھینکتا اور آگ کو تیز کر دیتا۔ صبح کا ناشتہ بھی ان کی روایتی ڈشوں سے آراستہ تھا۔ جس میں خاص کر اخروٹ کے مغر کی روٹی جو کہ دیسی گھی میں بنائی گئی تھی بے حد مزیدار تھی جس کا ذائقہ ہم آج تک نہیں بھولے۔



جشن چاو موس

مبارک ہو مبارک ہو چاو موس مبارک ہو!

ہاں شاید وہ یہی کہہ رہے تھے کیونکہ آج ان کا مقدس تہوار ”چاو موس“ ہی تھا یقیناً ان کو یہی کہنا تھا کیونکہ آج وہ پاک تھے ان کے دلوں میں محبت اور خوشی کے طوفان امنڈ رہے تھے۔ ڈھول کی تھاپ بھی میرے کانوں تک پہنچتے پہنچتے بالکل ٹھنڈی بن چوری تھی ان کا ہاؤ ہوا اور بے ہنگم شور باریک اور موٹی آوازیں بالکل مقدس پاک اور حمد یہی محسوس ہو رہی تھی۔ نہیں میں بالکل ان کی زبان نہیں جانتا تھا لیکن میرا ادراک اور سماعت یہی سمجھ رہے تھے۔

ہم چاروں اس دور دراز جنگل میں جس مکان میں بیٹھے تھے ان کے جشن منانے والے مقدس عبادت خانے اور قربان گاہ سے تقریباً دو فرلانگ دور تھے لیکن ان کے اجتماعی رقص اور آوازوں کو واضح طور پر محسوس کر رہے تھے یہ لکڑی پتھر اور گارے سے بنا ہوا مکان ہمارے مسلمان دوست کا تھا۔ درمیان میں آتش دان تھا جس میں دیار اور چیز کی لکڑیاں تراخ تراخ بڑی تیزی سے جل رہی تھیں اور آتش دان کے چاروں طرف ہمارے بستر فرش پہ بچھے ہوئے تھے ہم آگ تاپ رہے تھے اور انگور کھا رہے تھے۔ ہمارے درمیان سیب انگور اور اخروٹ بڑے سے تھال میں پڑے تھے اور ہم چاروں نادیدوں کی طرح کھائے جارہے تھے۔ کمرہ گرم تھا اور ہمارے دائیں طرف گرنے والا جھرنّا اور اس کا مترنم گیت اور ندی کا مدہم شور بھی فضا میں سحر پھونک رہے تھے۔

شاہ والا کی چوٹی سے لے کر پوری وادی برف کے سفید نور میں لپٹی ہوئی تھی اور پھر چودھویں کا چاند وادی پہ چاندنی بکھرائے مسکرا رہا تھا۔ اس سحر زدہ ماحول اور فضا میں اپنی روح کو آزادانہ تیرتے ہوئے اور خوشی سے ناپتے ہوئے محسوس کر رہا تھا کہ یہ قدرت ہے۔ یہ فطرت ہے اور میری ذات شاید اسی قدرت اور فطرت میں بکھر گئی ہے اور میں اپنی روح کے عرفان میں ہوں اور میں اس فطرت سے قریب سے قریب تر ہونا چاہتا تھا۔ میری روح جو سرور اور تازگی محسوس کر رہی تھی مجھے شعور اور آگہی سے قریب کر رہی تھی۔ یہ دنیا کی عجیب و غریب قوم جو کافر کے نام سے جانی جاتی ہے مجھے خدا کے وجود کو تسلیم کروا رہی تھی اور اس کی ذات کا ادراک اور فہم مجھے وہیں سے عطا ہوا۔ عظیم ہیں وہ انسان جو انسان کے لئے ہیں جو انسانوں کے لئے محبت اور قربانی کا جذبہ رکھتے ہیں۔

مبارک ہو مبارک ہو ”چاو موس مبارک ہو!“ ”چاو موس“ سال کا سب سے بڑا تہوار ہے جو تقریباً دس دن رہتا ہے کیلاش

مذہب کی زیادہ تر رسومات چاؤ موس کے تہوار کی نسبت سے ہی ادا کی جاتی ہیں۔ دراصل یہ تہوار گزرے ہوئے سال میں امن وامان اور اچھی فصلیں بونے کی بنا پر منایا جاتا ہے اور آنے والے سال کو خوش آمدید کہنے کے لئے منایا جاتا ہے۔ وادی کے تمام لوگ اپنے گھروں میں آتش دان کے قریب بیٹھ کر قصے کہانیاں سناتے ہیں اور مئے نوشی کرتے ہیں۔



”سرازاری“

کیلاش لوگ تقریباً پورا سال کوئی نہ کوئی تہوار مناتے رہتے ہیں یہ لوگ اس مختصری زندگی میں تمام خوشیاں لوٹ لینا چاہتے ہیں اور ہر ہفتہ دس دن بعد ناپتے گانے اور خوشیاں منانے کا بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یہ لوگ بہت ہی غریب ہیں لیکن انتہائی قناعت پسند اور ہر حال میں خوش رہنے والے لوگ ہیں ان میں پیسے کا لالچ اور کینہ ہے ہی نہیں۔

”سرازاری“ بھی دراصل چاؤ موس ہی کے سلسلے کا تہوار ہے بلکہ اس رسم سے ہی چاؤ موس کی تقریبات شروع ہوتی ہیں۔ آج سات دسمبر ہے رات کو برف باری زیادہ ہوئی لوگ ابھی تک اپنے گھروں میں بند ہیں یا پھر اپنے مکانوں کی نازک چھتوں سے برف ہٹا رہے ہیں ہم ندی کے کنارے بڑے بڑے بے ترتیب پڑے ہوئے پتھروں پہ بیٹھ گئے۔ ارد گرد کی چوٹیاں برف سے بالکل سفید تھیں۔ ندی کے پانی میں ست روی تھی۔ شیر عالم نے آکر بتایا کہ آج شام ”سرازاری“ کی رسم ادا کی جائے گی جو کہ بڑی دلچسپ ہے سارا دن دھوپ میں بیٹھ کر کیلاش لڑکوں کو کھیلتے دیکھتے رہے یہ کھیل ہمارے ہاں ”گلی ڈنڈے“ جیسا کوئی کھیل تھا جو کہ وہ برف پہ کھیل رہے تھے ہم دھوپ میں بیٹھے سردی سے محفوظ نہ تھے لیکن وہ برف پہ کھیلتے ہوئے بالکل معمولی سے کپڑے پہنے ہوئے تھے شاید ماحول نے ان کو سخت جاں کر دیا تھا اس لئے وہ بالکل سردی محسوس نہیں کر رہے تھے۔

شام کا کھانا کھا کر قربان گاہ کے نیچے میدان میں لوگ اکٹھا ہونا شروع ہو گئے۔ دوڑ کے ڈھول بجا رہے تھے۔ سردی بہت زیادہ تھی لیکن پھر بھی میدان میں گاؤں کے تقریباً تمام کیلاش جمع تھے۔ گھاس پھونس کے دو بڑے بڑے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ شیر عالم نے بتایا کہ ایک ڈھیر لڑکوں کا ہے جو کہ انہوں نے جنگل سے گھاس پھونس جمع کر کے بنایا ہے اور دوسرا لڑکیوں کا ہے دراصل یہ ایک مقابلہ ہے اب ان ڈھیروں کو آگ لگا دی گئی۔ ڈھول کو خوب پیٹا گیا لڑکیوں نے اپنے ڈھیر کے گرد اور لڑکوں نے اپنے ڈھیر کے گرد خوب رقص کیا اور ساتھ ساتھ کچھ گابھی رہے تھے۔ اس کے بعد لڑکیوں نے اکٹھے ہو کر خوب رقص کیا اور قہقہے لگائے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ لڑکیوں کے خوش ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ جیت گئی ہیں کیونکہ ان کے گھاس پھونس کے ڈھیر کی آگ کے شعلے لڑکوں کے ڈھیر سے زیادہ اونچے تھے۔ سرازاری کی یہ رسم مردوزن میں عمل و ہمت کی تحریک کے لئے ادا کی جاتی ہے کیونکہ لڑکیاں جیت چکی تھیں اور اب وہ گا کر لڑکوں کو شرمندہ کر رہی تھیں جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے!

”تم میں شاید مردانگی اور جرات کی کمی ہوگئی ہے کیونکہ تم نازک صنف حسیناؤں سے ہار گئے ہو“

میں نے پوچھا اگر لڑکے جیت جائیں تو پھر وہ کیا کرتے ہیں تو شیر عالم نے بتایا کہ وہ بھی لڑکیوں کو شرمندہ کرنے کے لئے ایسے ہی گانے گائیں گے۔ ”اے حسیناؤں تم صرف نازک اندام اور نرمیلی ہی ہو تم میں قوت عمل نہیں“

آہستہ آہستہ یہ لوگ منتشر ہو کر اپنے گھروں کی جانب چل دیئے۔ ہم چاروں بھی اس رسم پہ تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ٹھکانے کی طرف چل دیئے۔



گوش سارس

یہ بھی چاؤ موس کی ہی ایک رسم ہے۔ یہ سرازاری کے دو دن بعد ادا کی جاتی ہے۔ ”گوش سارس“ کے معنی گوہر کی راکھ سے صفائی کرنا کے ہیں۔ اس دن صبح ہی سے تمام کیلاش لوگ اپنے گھروں اور مویشی خانوں کی صفائی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ صفائی کرنے کو بعد گوہر کی راکھ اپنے گھروں اور گھروں کی چھتوں اور مویشی خانوں میں یہ راکھ بکھیر دیتے ہیں۔ کیلاش لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس طرح تمام بدروحیں بھاگ جاتی ہیں اور ان کے مویشیوں اور انسانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تیں۔

میں نے کیلاش گھروں میں خوب گھوم پھر کر دیکھا ہے کہ یہ لوگ صفائی بالکل نہیں کرتے، صرف سال میں اسی دن صفائی کرتے ہیں، چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی رہتی ہیں گھر کی دیواریں اندر آگ جلانے کی وجہ سے بالکل سیاہ ہو چکی ہیں۔ البتہ برتن اور کپڑے خوب دھوتے ہیں اور نہاتے بھی ہیں اسی دن ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہوا، شیر عالم ہمارے پاس فیصل آباد کئی مہینے رہا تھا اور وہ ہماری تہذیب سے بڑا متاثر ہوا تھا تو اس نے ”گوش سارس“ کے دن گاؤں کے بہت سے لوگوں کو اکٹھا کیا اور بتایا کہ صفائی سال میں صرف ایک دن کافی نہیں ہے۔ گھر اور مویشی خانے گندے رہنے سے بیماریاں پھیلتی ہیں اس لئے اپنے گھروں میں روزانہ صفائی کیا کرو، شیر عالم ابھی اپنی تقریر کر رہی رہا تھا کہ کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے!

کہنے لگے اس لڑکے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ پڑھ لکھ کیا گیا ہے کہ اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ گیا ہے۔ بہت سے کیلاش اس کے خلاف ہو گئے کہنے لگے ہمارے بڑوں نے تو ہمیں بتایا نہیں، تم کون ہوتے ہو ہمیں سبق دینے والے کہ صفائی کیا کرو، شیر عالم اس سرزنش پر کافی رنجیدہ ہوا۔



چوئی تاری

اوپر والے میدان میں کافی لوگ جمع تھے۔ کچھ ”ہان“ کے اندر بھی تھے۔ ڈھول بج رہا تھا اور کچھ کیلاش ڈھول کی تھاپ پہ رقص بھی کر رہے تھے یہ گوش سارس کے اگلے دن کی ہی بات ہے۔ شیر عالم نے بتایا کہ آج چوئی تاری کی رسم ہے۔ چوئی ایک درخت کا نام ہے اور یہ کیلاش لوگوں کے نزدیک بہت مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اس دن چوئی کی ٹہنیوں سے برش نما قلم بنا کر اور اخروٹ کے چھلکوں کی راکھ کو مٹی میں ملا کر سیاہی بنا لیتے ہیں اور پھر ”ہن“ کی دیواروں پر تمام لوگ کوئی نہ کوئی تصویر ضرور بناتے ہیں۔

ہم نے اندر جا کر دیواروں پہ دیکھا تو بہت سی تصویریں بھیڑ بکری اور اٹلی سیدھی مکروہ سی بے معنی تصویریں بھی بنی ہوئی تھیں۔ جو تصویر بنالیتا وہ اس اجتماعی رقص میں شامل ہو جاتا۔ ڈھول کی تھاپ بہت ہی دھیمی تھی اور رقص بھی بہت ہی آہستہ آہستہ کیا جا رہا تھا۔ شیر عالم نے بتایا کہ اب یہ تمام لوگ انتہائی خاموشی سے اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے اور ہر آدمی کوشش کرے گا کہ منہ سے اونچی آواز نہ نکالے۔ خاموشی تو خیر ان وادیوں میں آبادی کم ہونے کی وجہ سے پہلے ہی کافی تھی لیکن اس رات بالکل کسی طرف سے بھی کسی انسان کی آواز نہ آرہی تھی بلکہ گھر کے لوگ بھی ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں باتیں کرتے تھے۔

بکری کیلاش لوگوں کے لئے ایک مقدس جانور ہے اس کی تصویریں زیادہ لوگ بناتے ہیں اور کچھ لوگ بھیڑ اور بکری کے آٹے کے مجسمے بھی بناتے ہیں اور ان مجسموں کو وہیں ”ہان“ میں رکھ آتے ہیں۔ ساری رات پوری دادی پہ سکوت چھایا رہا۔ کسی طرف سے کسی انسان کی ہلکی سی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔



کھوٹرامو

ابھی اذان نہیں ہوئی تھی کہ پوری وادی بے ہنگم شور سے تھرا اٹھی بلکہ ہماری آنکھ بھی اسی شور سے کھلی۔ ہر طرف سے کیلاش عجیب و غریب آوازیں ہاں ہو پکڑو دوڑو جیسے بہت سے ریوڑ کو ہانکا جا رہا ہو۔

شیر عالم نے بتایا کہ یہ ”کھوٹرامو“ ہے رات جو تصور یں اور مجسمے بتائے تھے اور خاموشی اختیار کی تھی اس کا مطلب تھا کہ ”ہان“ میں رکھے ہوئے مجسمے کہیں ہماری آواز سن کر بھاگ نہ جائیں۔ اب تمام وادی کے لوگ شور مچا رہے ہیں تاکہ وہ ”ہان“ میں آئے سے بنے ہوئے مجسمے شور سن کر بھاگ جائیں۔

میں نے پوچھا کہ یہ مجسمے بھاگ کر کہاں جائیں گے تو شیر عالم نے بتایا کہ وادی کے آخر میں جو ”شاہ والا“ پہاڑ ہے اس کی دوسری طرف ایک بہت بڑی جھیل ہے۔ اس جھیل کے دوسرے کنارے پہ جو برف ہے یہ تمام مجسمے جو رات بنائے گئے تھے یہ شور سن کر جھیل کے دوسرے کنارے والی برف پر ابھر آئیں گے اور پھر بکریاں آئندہ سال زیادہ بچے دیں گی۔ میں نے بہت سے کیلاش لوگوں سے پوچھا کہ کیا آپ نے اس پہاڑ کی دوسری جانب جھیل کے کنارے ان مجسموں کو ابھرتے دیکھا ہے تو تمام لوگوں نے ایک سا جواب دیا۔ دیکھا تو نہیں لیکن ہوتا ایسا ہی ہے۔

دراصل یہ صرف ان کی توہم پرستی ہے۔ ایسا بالکل نہیں ہوتا۔ ان کے مزہبی راہنماؤں نے ان کو اتنا ڈرا رکھا ہے کہ ادھر جانے کا کسی کو حوصلہ ہی نہیں ہوتا۔ بہت سے کیلاشوں نے بتایا کہ ایک دفعہ ایک آدمی ان کو دیکھنے گیا تھا لیکن واپس ہی نہیں آیا۔ پھر اس کا بیٹا اس کو ڈھونڈنے گیا تو وہ بھی آج تک واپس نہیں آیا۔

”مدھیک“

مدھیک بھی چاؤ موسیٰ ہی کی ایک رسم ہے۔ یہ پندرہ دسمبر کو ادا کی جاتی ہے۔ کیلاش لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے جو عزیز مر چکے ہیں ان کی روحمیں اپنے رشتہ داروں کے گھر آتی ہیں اس لئے ہر گھر کے لوگ کھانے والی تمام اشیاء تھوڑی تھوڑی مقدار میں ”ہان“ کے باہر رکھ دیتے ہیں۔ اور ہر گھر کا بزرگ قبرستان کی جانب منہ کر کے اپنے اپنے مردوں کو بلاتا ہے اور اپنے مرے ہوئے عزیزوں کو کہتا

ہے کہ ہم نے آپ کے کھانے کا بندوبست کر دیا ہے اس لئے ”ہان“ کے پاس آ کر کھا جاؤ۔

میں نے دیکھا کہ بہت سے بوڑھے لوگ قبرستان کی جانب منہ کئے عجیب و غریب آوازیں نکال رہے تھے میں نے وہاں موجود لوگوں سے پوچھا کہ یہ واقعی مردے یہ کھانے کھا جائیں گے انہوں نے جواب دیا کیونکہ وہ مردے صرف روحمیں ہوتی ہیں اس لئے وہ کھانا تو نہیں کھاتے لیکن ان کھانوں میں ذائقہ نہیں رہتا بالکل پھیکے ہو جاتے ہیں اور پھر کھانے معصوم بچوں میں تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔

مجھے وہ کھانے چکھنے کا اتفاق تو نہیں ہوا لیکن وہ کھانے بے ذائقہ بالکل نہیں ہوتے یہ صرف کیلاش لوگوں کا عقیدہ ہے اس کے بعد تمام مرد اور عورتیں مل کر خوب رقص کرتے ہیں اور بے ہنگم سا شور بھی مچاتے ہیں۔ یہ رقص رات گئے تک جاری رہتا ہے ان کا عقیدہ ہے کہ مردوں کی روحمیں کھانے کھا کر خوش ہو گئیں ہیں اور سکون سے ہیں۔ اس لئے یہ رقص کافی زور و شور سے کیا جاتا ہے۔

آدھی رات تک نو جوان لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کی بانہیں پکڑ کر خوب اودھم مچاتے ہیں۔ خواہ کسی کی بہن ہو، بیوی ہو، ایک دوسرے سے خوب ہنسی مذاق کیا جاتا ہے اور کوئی بھی ایک دوسرے کو منع نہیں کرتا ان کا عقیدہ ہے کہ یہ صرف مردوں کی روحوں کو سکون پہنچانے کے لئے کیا جاتا ہے۔

ششورات

چاو موس کی یہ رسم 17 دسمبر کو ادا کی جاتی ہے یہ بھی بڑی دلچسپ رسم ہے۔ ہر کیلاش گھر کا بڑا بیٹا اور اسکی بیوی اگر بڑا بیٹا شادی شدہ نہ ہو تو پھر بھی بڑا بیٹا خود ہی نہادھو کر پاک صاف ہو جاتا ہے اور مویشی خانے کی چھت پہ بیٹھ کر گھر کے ہر فرد کے لئے پانچ پانچ روٹیاں پکائے گا۔ یہ روٹیاں اخروٹ کی گری اور نمک ملا کر پکائی جاتیں ہیں۔

اس سے مراد یہ ہے کہ گھر کا بڑا بیٹا گھر کے تمام افراد کی کفالت اور حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ یہ رسم اسی بنا پر ادا کی جاتی ہے کیونکہ ہم بھی ان دنوں ان کے مہمان تھے اس لئے ہمارے لئے بھی روٹیاں پکائی گئیں۔

پش ستونگس ”بدھ سنیک“

یہ بھی چاو موس ہی کی رسم ہے جو کہ 19 دسمبر کو ہوتی ہے۔ یہ رسم بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہم مسلمان اپنے بچوں کے ختنے اور عقیقہ

کرتے ہیں۔ اس رسم میں جو بچے دو سال کے ہو چکے ہوتے ہیں ان کو بھیڑ کی سیاہ اون سے گھر میں تیار کئے ہوئے کپڑے پہنا دیئے جاتے ہیں۔ باور رہے کہ سیاہ اون کے کپڑے کیلاش لوگوں کے نزدیک انتہائی مقدس ہیں۔ کیلاش مذہب میں آج کل بھی عورتیں سیاہ لباس ہی پہن سکتی ہیں۔ کیونکہ سیاہ اون سے کپڑا بڑی مشکل سے بنتا ہے۔ اس لئے عورتیں عام سیاہ کپڑے ہی سے کام چلا لیتی ہیں۔ دو سال کے بچوں کو سیاہ اون سے بنے کپڑے پہنانے کا مطلب ہے کہ اب بچہ مکمل طور پر کیلاش بن گیا ہے۔ اس دن بچوں کے ماموں بچوں کے لئے بکرے تحفہ کے طور پر لے کر آتے ہیں۔ اگر بچی ہو تو اس کے لئے بکری کا تحفہ لاتے ہیں۔ بچوں کے ماموں ان کے لئے پھل کپڑے اور دوسری استعمال کی چیزوں کے تحفے ٹوکروں میں رکھ کر لاتے ہیں۔

جس کسی نے بھی اپنے بچے کو اون کے مخصوص کپڑے پہنانا ہوتے ہیں وہ پوری وادی کی دعوت بھی کرے گا۔ پھل دودھ گوشت اور انگور کے پانی کے ساتھ دعوت کی جاتی ہے۔ دعوت کھانے کے بعد تمام لوگ خوب رقص کرتے ہیں اور بچے کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار گا کر کرتے ہیں۔ بچے کے والدین بچے کی ماموں کو بھی تحفے دے کر رخصت کرتے ہیں۔ ندی کے کنارے ٹین کے کنستروں میں پانی گرم کر کے بچے کو مل کر خوب نہلایا جاتا ہے۔

چانجارات ”چاؤ موس“

چاؤ موس کی اہم ترین اور خاص رسم ہے اور یہ رسم بڑے اہتمام سے ادا کی جاتی ہے۔ ”چاؤ موس“ دراصل اسی رسم کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہمارے ہاں عید منائی جاتی ہے جو کیلاش ملازمت یا کسی اور کاروبار کے سلسلے میں وادی سے باہر گئے ہوتے ہیں وہ بھی ”چانجارات“ کو ہر صورت میں اپنے گھروں کو آ جاتے ہیں اور اپنے اہل خاندان کے ساتھ چاؤ موس کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔

آج 20 دسمبر تھا آج تمام کیلاش ”چاؤ موس“ کی تیاری میں مصروف تھے۔ وادی میں جو دو تین دکانیں ہیں وہاں سے سودا سلف خرید اجارہ تھا۔ عورتیں ندی کے کنارے کی اوٹ میں کپڑے دھو رہی تھیں اور ٹین کے کنستروں میں پانی گرم کر کے نہا رہی تھیں۔ شیر عالم نے بتایا کہ آج شام کے بعد کوئی بھی کیلاش غیر کیلاش سے ہاتھ نہیں ملائے گا کیونکہ آج تمام کیلاش نہا دھو کر پاک ہو چکے ہیں۔ اب کیلاش ہن اور دوسری مقدس جگہوں پر مختلف رسمیں ادا کر کے پرسوں واپس آئیں گے اور پھر تمام وادی کے لوگوں کی دعوت کریں گے جن میں مسلمان اور باہر سے آئے ہوئے تمام دیگر لوگ شرکت کریں گے۔

آج تمام کیلاش اپنے گھروں میں قربانیاں کریں گے۔ مردوں کے لئے بکرے اور عورتوں کے لئے بکریاں ذبح کی جائیں گی۔

ہمارے لئے بھی قربانی کا بکرا شیر عالم کے گھر سے آیا ہوا تھا تاکہ اسے ذبح کر کے گوشت کی دعوت اڑائیں۔ مہمان خانہ جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے اس کا پچھلا دروازہ ”ہن“ کو جانے والے راستے کی طرف تھا۔ ہم دروازے کے باہر بیٹھ کر ”ہن“ کی طرف جانے والے کیلاشوں کو دیکھ رہے تھے۔ سب لوگوں نے نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ لڑکیوں نے سیاہ چوغوں پہ کشیدہ کاری کی ہوئی تھی۔ سر پہ کڑیوں اور بنوں کی بنی ہوئی ٹوپی پہ مرغ زریں کے پروں کا بنا ہوا پھول لگا رکھا تھا۔ چھٹے کے اوپر کمر سے بندھی پتی سے چھوٹے چھوٹے گھنگھر و لگے ہوئے تھے۔ یعنی ہر عورت نے خوب بناؤ سنگھار کر رکھا تھا۔

”ہان“ سے ڈھول کی دھیمی آواز آرہی تھی اور اندھیرے میں جاتی ہوئی عورتوں کی پیٹوں میں لگے گھنگھروؤں کی آوازیں بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ اتنے میں شیر عالم کی والدہ ہمارے لئے انگور سیب اور ناشپاتیاں لے کر آئی اس نے شیر عالم کے ساتھ کیلاشی زبان میں کچھ باتیں کیں۔ شیر عالم نے بڑے غصے سے اسے کچھ جواب دیا کیونکہ ان کی گفتگو کیلاشی میں تھی۔ اس لئے ہمارے پلے کچھ نہ پڑا۔ میں نے شیر عالم سے پوچھا کیا بات ہے اس نے بتایا کہ میری والدہ کہہ رہی ہے کہ تم بھی تیاری کر کے ”ہن“ میں چلو لیکن میں آپ لوگوں کو چھوڑ کر ”ہن“ میں نہیں جاسکتا کیونکہ اگر میں وہاں چلا گیا تو دودن تک آپ کے ساتھ نہیں رہ سکوں گا کیونکہ آپ مسلمان ہیں اور آئندہ دودن تک کوئی بھی کیلاش آپ کے پاس نہیں ٹھہر سکتا۔ کیلاش مذہب کے دستور کے مطابق اب تمام کیلاش پاک ہیں اور آئندہ دودن تک کسی غیر کیلاش سے اگر ملیں تو ناپاک ہو کر کیلاش مذہب سے خارج سمجھے جائیں گے۔ آپ اتنی دور سے صرف میرے لئے آئے ہیں میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ عجیب مسئلہ تھا اس کی والدہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ رحم طلب نظروں سے ہماری جانب دیکھ رہی تھی۔ ہم نے شیر عالم سے کہا کہ جیسا آپ کی والدہ کہتی ہے ویسا کرو۔ لیکن وہ مان ہی نہیں رہا تھا۔ آخر ہم نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی والدہ کی بات مان لے۔

شیر عالم نے کہا کہ آپ بھی میرے ساتھ ہی جائیں گے۔ میں دیکھتا ہوں آپ کو ”ہن“ کے اندر جانے سے کون روکتا ہے۔ وہ گاؤں کے بہت سے نوجوانوں کو ساتھ لے کر ہمارے پاس آیا کہ آئیں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں ہم ان کے ساتھ چل دیے۔ ابھی ہم ”ہن“ سے تقریباً سو گز دور تھے کہ گاؤں کے سردار اور بڑے ہمارے راستے میں کھڑے ہو گئے وہ بہت غصے میں تھے۔ شیر عالم کے ساتھ جو نوجوان تھے وہ بھی بہت غصے میں تھے وہ ان بڑوں سے بحث کرنے لگے۔ شیر عالم اور اس کے ساتھی بھند تھے کہ ہم اپنے مہمانوں کو ”ہن“ کے اندر ضرور لے کر جائیں گے لیکن وہ بڑے کہہ رہے تھے ایسا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہوگا کہ غیر کیلاش چانجا رات کو ہن کے اندر آئیں۔

ہم نے بات بگڑتے دیکھی تو شیر عالم اور اس کے ساتھیوں کو سمجھایا کہ یہ آپ کے مذہب کا معاملہ ہے لہذا ہم ”ہن“ کے اندر نہیں جائیں گے۔ بہاری وجہ سے آپ کے اور آپ کے بزرگوں کے درمیان جھگڑا ہو ہم ایسا بالکل نہیں چاہتے۔ ہم واپس ہو لیے اور شیر عالم بھی ہمارے ساتھ واپس آ گیا اس کی والدہ پھر اسے لینے کے لئے آئی لیکن شیر عالم نے جانے سے انکار کر دیا۔ بڑی مشکل سے ہم نے اسے سمجھا کر اس کی والدہ کے ساتھ بھیجا۔

شیر عالم اپنی والدہ کے ساتھ جاتے ہوئے بلک بلک کر رونے لگا۔ کہنے لگا بھائی میں آپ لوگوں کے کہنے پر ماں کے ساتھ جا رہا ہوں ورنہ مجھے ان جھوٹی رسوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

ہم بھی اس واقعہ سے کافی رنجیدہ ہوئے۔ تقریباً نو بجے کا وقت ہو گا کہ تمام وادی ڈھولوں کی آواز سے تھرا اٹھی۔ ہم اپنے کمرے سے نکل کر باہر آئے تو دیکھا کہ بہت سے لوگ ہاتھوں میں مشعلیں اٹھائے ہوئے ڈھول کی تھاپ پہنا چکے ہوئے قربان گاہ کی طرف جا رہے ہیں۔ بڑا عجیب سماں تھا ہر گاؤں سے لوگ مشعلیں اٹھائے ناچتے گاتے ٹولیوں کی شکل میں قربان گاہ کے قریب اکٹھے ہو رہے تھے ان میں بچے بوڑھے جوان اور لڑکیاں سبھی شامل تھے۔

ہم وہاں نہیں جاسکتے تھے اور شیر عالم بھی اب دودن تک ہمارے پاس نہیں آ سکتا تھا اور میں یہ سارا کچھ جاننے کے لئے بے تاب تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ تقریباً رات کا ایک بجایا ہو گا۔ دروازے پر دستک ہوئی میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو حیران رہ گیا۔ باہر شیر عالم کھڑا تھا یہ دسمبر کی بیس تاریخ تھی۔ ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔ سردی انتہا کی تھی میں نے کہا اندر آ جاؤ اس نے کہا میں اندر نہیں آ سکتا کیونکہ دو آدمی میری نگرانی کر رہے ہیں اور وہ پیچھے کھڑے ہیں میں تو کیمرو میں فلم ڈالنے کے بہانے وہاں سے آیا ہوں۔ ابھی چلا جاؤں گا میں نے چانجارات کے بارے میں اس سے کچھ سوال کئے اور اس نے چانجارات کے بارے میں بتایا کہ چانجادر اصل چیز کی اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کے ایک سرے کو مشعل کی طرح جلایا جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ یہ مشعلیں سی جل رہی ہیں اسی کو چانجا کہتے ہیں۔ اب تمام کیلاشوؤں نے انگور کا پانی پی رکھا ہے جس میں ہلکا ہلکا نشہ ہے اور اب یہ لوگ صبح کا اجالا پھیلنے تک برف پہنا چکے گاتے اپنے چانجوں کو جلائے ہوئے ”دیوار دور“ جو کہ قربان گاہ والے پہاڑ کی چوٹی پہ ہے وہاں جائیں گے۔ پھر دوسرے پہاڑ پہ ایک جگہ ”مہادیو“ ہے اور یہ قربان گاہ بتریک گاؤں میں ہے وہاں جا کر قربانیاں کریں گے۔ پھر وہاں سے پہاڑ کی دوسری جانب ”اورائن“ ایک اور قربان گاہ ہے۔ وہاں صرف مرد لوگ جائیں گے وہاں عورتیں نہیں جاسکتیں۔ ”اورائن“ کے مقام پہ مرد لوگ ایک اہم فیصلہ کرتے ہیں۔ یعنی اس رات وادی کے کیلاش لوگ اپنے سردار منتخب کرتے ہیں۔ سردار کا انتخاب ایک سال کے لئے ہوتا ہے اور آئندہ

سال کے لئے یہ سردار کیلاش لوگوں کے لئے سردار کے علاوہ مذہبی اور روحانی پیشوا بھی ہوتا ہے۔

جب تمام لوگوں کی رائے سے سردار منتخب ہو جاتا ہے۔ وہ گائے کے گوبر کا ایک ٹکڑا لے کر اس میں سراخ کرتا ہے اور پہاڑ کی چوٹی پہ جا کر اس سراخ میں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور پشین گوئی کرتا ہے کہ سورج اپنے مدار میں ہے اور آئندہ سال کی فصلیں خوب ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد اجتماعی دعا مانگی جاتی ہے اور پھر لوگ ناپتے گاتے ہوئے واپس ہن میں آ جاتے ہیں اور ”ہن“ میں ایک چھوٹا بکری کا بچہ ذبح کر کے اس کے خون کے چھٹے تمام لوگوں پر پھینکے جاتے ہیں اس سے کیلاش لوگوں کا عقیدہ ہے کہ پچھلے تمام گناہ ختم ہو گئے ہیں۔ یہ سب کچھ بتا کر شیر عالم پھر ”ہن“ کی طرف لوٹ گیا۔

لوآک بیک

یہ بھی بڑی دلچسپ رسم ہے یہ چانچارات کے دو دن بعد ادا کی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ انتہائی سردی کے دن ہوتے ہیں اس لئے کیلاش لوگ صبح دس بجے تک سوتے رہتے ہیں۔ کرنے کے لئے اور کوئی کام نہیں ہوتا۔

تقریباً بارہ کا وقت ہوگا کہ وادی میں ہر طرف ہوا شور و غل ڈھول اور کنستروں کو پینا جانے لگا۔ پوچھنے پہ معلوم ہوا کہ وادی کے تمام کیلاش لومڑی کی تلاش میں ہیں۔ باہر آ کر دیکھا تو تمام کیلاش لوگ خوب شور مچا رہے تھے۔ جھاڑیوں پہ ڈنڈے مار رہے تھے کچھ لوگ مل کر جانکا کر رہے تھے۔ شیر عالم نے بتایا کہ ہر سال اسی دن لوگ لومڑی کو تلاش کرتے ہیں اب اگر کسی جھاڑی یا غار سے لومڑی نکل آئی تو تمام لوگ گھیرا ڈال کر اسے ندی کے پار بھگا دیں گے۔ اگر یہ لوگ لومڑی کو تلاش کر کے ندی کے پار بھگانے میں کامیاب رہے تو اس کو نیک شگون سمجھا جائے گا اور اس کا مطلب ہوگا کہ اس سال برف باری کم ہوگی اور فصلیں بہت اچھی ہوں گی۔

ہم تو دور تھے لیکن شیر عالم نے بتایا کہ لومڑی نکل آئی تھی اور اسے ندی کے پار بھگا دیا گیا ہے۔ اشرف کھوکھر نے کہا کہ بھائی یہ لومڑی ہے یا سونا پور یا کھاؤ کیونکہ تمام فصلیں ندی کے پار ہی ہوتی ہیں۔ دیکھو شیر عالم بھائی لومڑی کا یہ راز کہیں سرکاری اہلکاروں کو نہ بتا دینا۔ اگر ان کو پتہ چل گیا تو پھر یہ لومڑی وادی بمبوریت میں کہیں نظر نہیں آئے گی۔ کیونکہ کبھی یہ میاں چنوں میں ہوگی، کبھی لومڑی کی ڈیمانڈ پیر آف پگاڑہ سندھ کے لئے کریں گے بلکہ لومڑی پہ بحث اسمبلی میں ہوگی کہ اب لومڑی کو کس علاقہ میں بھگایا جائے کہ وہاں کی زمین زرخیز ہو جائے۔ شیر عالم نے کہا آپ تو مذاق کرتے ہیں لیکن میں پھر کہوں گا کہ ندی کے اس پار لومڑی کو بھگانے سے فصل اچھی ہوتی ہے اس کے بعد ہن میں آ کر تمام کیلاش لوگ خوب رقص کرتے ہیں اور انگور کا پانی پیتے ہیں۔

داؤ تاتو

یہ رسم لوآک بیک سے اگلے دن ہوتی ہے۔ ہم ندی سے منہ ہاتھ دھو کر آرہے تھے کہ اوپر والے گاؤں میں ڈھول بجنا شروع ہو گیا۔ ہم بھی ادھر چلے گئے۔ دیکھا کہ ایک لڑکا اور لڑکی ناچ رہے ہیں اور گارہے ہیں۔ شیر عالم نے بتایا کہ آج ”داؤ تاتو“ کی رسم ہے۔ یہ جو لڑکا اور لڑکی ناچ رہے ہیں یہ اسی طرح ناچتے ہوئے گاؤں کے ہر گھر میں جائیں گے اور ہر گھر سے ایک ایک مٹھی بھر لو بیا لیں گے اور پھر جب بہت سا لو بیا اکٹھا ہو جائے تو ”ہن“ میں جا کر ایک دیگ میں لو بیا ایلنے کے لئے رکھ دیا جائے گا۔ گاؤں کی تمام لڑکیاں اور لڑکے ”ہن“ میں اکٹھے ہو کر بہرو پے کا کھیل کھیلیں گے یعنی ایک لڑکی لڑکوں والے کپڑے اور لڑکی پہنے گی اور لڑے لڑکیوں کی طرح کپڑے پہن کر خوب رقص کریں گے۔ یہ شغل رات گئے تک جاری رہتا ہے اور جن کنوارے لڑکوں اور کڑکیوں نے شادی کرنا ہوتی ہے تو لڑکا اس رات اس لڑکی کو بھگا کر اپنے گھر لے جاتا ہے اور ان کی شادی ہو جاتی ہے۔

کیلاش معاشرے میں عورت کو بہت سی آزادیاں بھی ہیں اور اس پہ بہت سی پابندیاں بھی ہیں۔ یعنی لڑکیوں کا ناچنا گانا اور اپنے پسند کے لڑکے کے ساتھ شادی کرنا۔

کیلاشوں میں زیادہ شادیاں اسی طرح ہوتی ہیں۔ کیونکہ لڑکے اور لڑکیوں کے ملنے پہ کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس رات لڑکا اپنی پسند کی لڑکی کو بھگا کر اپنے گھر لے جاتا ہے۔ لڑکی کے وارثوں کو جب پتہ چلتا ہے کہ ان کی لڑکی فلاں لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو وہ گاؤں کے بڑوں کو ساتھ لے کر لڑکے کے گھر جاتے ہیں اور لڑکی سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ اپنی مرضی سے آئی ہے یا اسے زبردستی لایا گیا ہے۔ لڑکی جواب دیتی ہے کہ میں اپنی مرضی سے آئی ہوں تو بس ان کی شادی ہو گئی۔ اب لڑکے والے بہت سے بکرے ذبح کر کے گاؤں کی دعوت کرتے ہیں اور لڑکی والے اپنی لڑکی کو بکریاں اور دوسرا سامان جہیز میں دیتے ہیں۔

کالیک

غالباً اس کے معنی کواہیں۔ یہ رسم کوے کی ہی ہے۔ یہ ”داؤ تاتو“ کے دوسرے دن ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ رات کو ہوتی ہے اس لئے اس کے بارے میں بھی شیر عالم نے بتایا کہ رات کو تمام کیلاش روٹیوں میں گوشت ڈال کر پکاتے ہیں اور پھر تمام گاؤں کے لوگ ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں اور گانا گاتے ہیں۔

اے پیارے کوے

ہمارے لئے سیام اور یونان سے
تمام نعمتیں لے کر جلدی سے آ جا
ہم تیرے انتظار میں ہیں
ہمیں اپنا دیدار ضرور کروا
اس سردرات میں ہم تیرا استقبال
کرنے کے لئے چشم براہ ہیں۔

اور عاشق لوگ کوئے کی بجائے اپنی محبوبہ کی تعریف کرتے ہیں۔

شیر عالم نے بتایا کہ پھر یہ گانا سنتے ہی ایک بالکل سفید کو آتا ہے اور کیلا شیوں کے دائیں ہاتھ میں کل والا ابلا ہوا لوبیا ہوتا ہے اور
بائیں ہاتھ میں اخروٹ کے چھلکے ہوتے ہیں۔ چھلکے تو کوئے کی طرف پھینک دیے جاتے ہیں اور لوبیا کھالیا جاتا ہے۔ اور پھر جس کوئے
کو مقدس سمجھا جاتا ہے اسے تو اخروٹ کے چھلکے مارے جاتے ہیں اور خود لوبیا کھا جاتے ہیں اور اس طرح ”جشن چاموس“ کا اختتام
ہوتا ہے۔

جشن چاموس کی تقریبات ختم ہوئیں۔ ہم نے اپنا سامان باندھا اور واپسی کی تیاری کی، ان دنوں ہم رحمت رحیم کے گھر میں
ٹھہرے ہوئے تھے اس لئے رحمت رحیم کے والد صاحب، والدہ صاحبہ ان کے بڑے بھائی محمد رحیم، بہن اور بھابھی تمام لوگ ہمیں
خدا حافظ کہنے کے لئے آئے۔

رحمت رحیم کے گھر کا بڑا سا صحن ہے۔ جس میں برف کی ایک موٹی تہہ بچھ چکی تھی۔ گھر والوں نے اپنی رسم کے مطابق ہمیں تحفے
دیئے، رحمت رحیم کی والدہ نے خشک میوؤں کے بنے ہوئے ہار ہمارے گلوں میں ڈالے اور رنگین دھاگوں سے بنی ہوئی پٹیاں بھی
ہمارے گلوں میں ڈالیں۔

گھر کے ہر فرد نے ہمیں خدا حافظ کہا، ان کی ہونٹوں پہ بکھری ہوئی مسکراہٹیں ہمیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ رحمت رحیم کے بڑے
بھائی کی بیوی جسے ہم بھابھی کہتے تھے۔ انتہائی معصوم اور بھولی بھالی خاتون ہیں۔ اس نے ایک ریشمی رومال جس پہ پھول کڑھے
ہوئے تھے خصوصی طور پر مجھے دیا۔ یہ تحفہ گھر کے تمام افراد کی موجودگی میں دیا تھا لیکن کسی فرد کے چہرے پہ ناگواری کے کوئی تاثرات
نہیں تھے۔

”محمود دانشور ایرانی“ نے اپنے سفر نامے ”کافرستان“ میں ان لوگوں کو سرخ کافر لکھا ہے جو کہ سراسر ان مسلمان لوگوں کی توہین ہے یہ لوگ مکمل مسلمان ہیں ان کا اخلاق انتہائی اچھا ہے۔ مہمان نواز اور اچھے کردار کے مالک ہیں۔ کیلاش لوگوں کے گھر کی چار دیواری نہیں ہوتی لیکن اس وادی میں رہنے والے تمام مسلمان لوگوں کے گھروں کی چار دیواری ہے۔

اس کے بعد شیر عالم کی والدہ ایک بڑے تھال میں اگلور، سیب، ناشپاتیاں اور خشک میوے لے کر آئی اور ہمارے گلے میں رنگین پٹیاں ڈالیں۔

شیر عالم کی والدہ وادی بمبوریت کی سمجھ دار ترین خاتون ہیں۔ ہمیں رخصت کرتے وقت تمام لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔



جوشی

وادی بمبوریت سے شیر عالم کا خط ملا کہ ”رحمت رحیم“ کی شادی ہے اس لئے آپ لوگوں کا اس شادی میں شامل ہونا سنت نہیں بلکہ فرض ہے۔ شیر عالم کے خطوط میں عموماً ایسے دلچسپ فقرے ہوتے ہیں کیونکہ وہ کافی عرصہ ہمارے ساتھ رہا ہے اور فرض کو اس نے انتہائی ضروری کے معنوں میں استعمال کیا تھا۔

الائیڈ سیاحت کلب کی میٹنگ ہوئی اور طے پایا کہ تمام ممبران رحمت رحیم کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے جائیں گے۔ چوہدری محمد صدیق، ڈاکٹر محمد ارشد چوہدری اور اشرف کھوکھر کے ذمے اس ٹور کے لئے خریداری کرنا اور دیگر ذمے داریاں سوئپی گئیں۔ سید مجاہد حسین کاظمی کے ذمے گیس ہانکنا لگایا گیا۔ جبکہ شاہ صاحب نے اپنا یہ فرض بحسن خوبی انجام دیا۔

یہ قافلہ 7 مئی 1992 کو محمد اشرف کھوکھر کی کابلی کی وجہ سے فلائیٹ کے مقررہ وقت سے چند منٹ لیٹ ایئر پورٹ پہنچا مگر خوش قسمتی سے جہاز بھی چند منٹ لیٹ تھا اس طرح یہ قافلہ اسلام آباد مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔ اسلام آباد سے ”سید و شریف“ اور پھر ”چترال“۔

سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا، ہلکی روشنی پہاڑوں کی چوٹیوں سے منعکس ہو کر وادی کے گلجے ماحول کو دلکش بنا رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دوباش کے مقام پہ پہنچ گئے۔ دوباش ایک خوبصورت جگہ ہے۔ یہاں وادی اور رمبر وادی بمبوریت سے آنے والی ندیاں مل کر ایک خوبصورت سنگھم بناتی ہیں یہاں سے دائیں طرف کا راستہ وادی رمبر کو جاتا ہے اور بائیں جانب کا راستہ وادی بمبوریت کو۔

ہمیں یہیں سے پتہ چلا کہ وادی بمبوریت کو جانے والی سڑک بند ہے اور جیپ آگے نہیں جاسکتی کیونکہ سلائیڈنگ کی وجہ سے سڑک کا ایک کلومیٹر ٹکڑا اپنی جگہ سے کھسک کر ندی میں جا گرا ہے۔

اس لئے ہم نے اپنا سامان کندھوں پہ رکھا اور پیدل چل دئے یہاں سے وادی بمبوریت کا پہلا گاؤں تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلہ پہ تھا۔ کندھوں پہ بوجھ سڑک ناہموار، عمودی چڑھائی اور بعض جگہ پاؤں رکھنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ راستہ انتہائی دشوار گزار تھا۔ تقریباً دو کلومیٹر چلنے کے بعد شاہ صاحب ہانپتے ہوئے بیٹھ گئے فضا میں خنکی ہونے کے باوجود شاہ صاحب پسینے سے شرابور تھے۔

چوہدری صدیق کہنے لگا شاہ تے حالوں بے حال ہو گیا اے۔ ایدے تے بیچ ای ڈھلے ہو گئے نے۔ تمام لوگوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ شاہ صاحب سنجیدہ ہو گئے کہنے لگے یا میری مدد کرو میرا بیگ ہی اٹھا لو میرا مذاق کیوں اڑاتے ہو۔

ہمارے ساتھ کچھ مقامی لوگ بھی پیدل جا رہے تھے کیونکہ وہ لوگ بہت ہی جفاکش ہیں پیدل چلتا چڑھتا اور اترتا ان کا روز کا معمول ہے۔ اس لئے وہ لوگ ہم سے کافی آگے نکل گئے ہم نے ان سے کہا کہ شیر عالم اور رحمت رحیم کے گھر پیغام دے دیں کہ آپ کے مہمان آرہے ہیں۔ شاہ صاحب تھوڑا سا چلنے کے بعد پوچھتے کہ ابھی کتنا سفر باقی ہے۔ آخر نڈھال ہو کر سڑک کے کنارے چت لیٹ گئے اور بری طرح ہانپنا شروع ہو گئے۔

اتنے میں رحمت رحیم کے بڑے بھائی محمد رحیم آگئے وہ سب سے گلے ملے اور سب لوگوں کا سامان اٹھا کر ہمارے ساتھ چل دیئے۔ انہوں نے اپنے مہمان خانے میں ہمارے رہنے کا بندوبست کر رکھا تھا۔

ابھی ہم چائے ہی پی رہے تھے کہ شیر عالم بھی پہنچ گیا۔ اس نے بتایا کہ مجھے آپ لوگوں کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی اس لئے میں نے ”جناح“ ہوٹل میں آپ کے لئے کمرے بک کروائے تھے۔

اس طرح محمد رحیم کے گھر سے سامان اٹھا کر ہوٹل میں آگئے ہوٹل کا منیجر ”مسٹر جناح“ ایک تیز طرار اور باتونی شخص ہے اور کافی روشن خیال بھی۔ جناح ہوٹل سرسبز و شاداب فصلوں میں گھر ایک دو منزلہ سستا سا ہوٹل ہے اور وادی کے تمام ہوٹلوں سے اچھا تصور کیا جاتا ہے۔

جب ہم ہوٹل کی دوسری منزل کے برآمدے میں بیٹھے قہوہ پی رہے تھے تو میں محسوس کر رہا تھا کہ جیسے ہم قبل مسیح کے زمانے میں آگئے ہیں۔ ہوٹل کے برآمدے کی رینگ قدیم طرز کی بنی ہوئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ کسی جانور کے بڑے بڑے سینگ لٹکے ہوئے تھے۔ پرانی طرز کی کرسیاں جو کہ بکری کی کھال کے تسموں سے بنی ہوئی تھیں ایک مشکیزہ ایک طرف پڑا تھا۔ برآمدے کے سامنے پیشا کے پھول لٹکے ہوئے تھے فضا میں انگوروں کی مہک بسی ہوئی تھی۔

رحمت رحیم کی شادی تو ملتوی ہو چکی تھی لیکن ہمیں بتایا گیا کہ دس مئی سے موسم بہار کا تہوار شروع ہو رہا ہے۔ موسم بہار کے اس تہوار کا نام ”جوشی“ ہے اور یہ تہوار تقریباً پندرہ دن جاری رہتا ہے۔

ان وادیوں میں رہنے والوں کے لئے سخت ترین سرما کا موسم ہے کیونکہ شدید برفباری کی وجہ سے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ بھیڑ بکریوں کے لئے چارہ نہیں ملتا۔ سخت سردی کی وجہ سے لوگ گھروں میں بند ہو کر رہ جاتے ہیں اس لئے موسم بہار کی تلاش لوگوں کے

لئے انتہائی خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ اس موسم میں فصلیں اگتی ہیں پھل پکتے ہیں سردی سے نجات ملتی ہے بکریاں بچے دیتی ہیں دودھ اور گھی کی فراوانی ہوتی ہے۔

جب موسم بہار کا پہلا پھول کھلتا ہے تو کوئی کیلاش دوشیزہ وہ پھول توڑ کر گاؤں میں لاتی ہے تو جوشی تہوار کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اس تہوار کے لئے ایک ہفتہ پہلے ہی دودھ دہی پنیر اور گھی اکٹھا کر لیا جاتا ہے۔ ایک بوڑھا کیلاشوں کے گھروں کے سامنے کھڑا اونچی آواز میں چلا رہا تھا۔ شیر عالم نے بتایا کہ یہ اعلان کر رہا ہے کہ سب لوگ پھول لینے کے لئے جنگل کی طرف چلو!

کچھ ہی دیر بعد نو جون لڑکیاں لڑکے بوڑھے بچے ناچتے گاتے ہوئے جنگل کی طرف چل دیئے اس موسم میں زرد رنگ کے پھول جھاڑی نما پودوں میں زیادہ کھلتے ہیں۔ ان کو ”پیشا“ کے پھول کہتے ہیں۔ پھر تمام لوگ پھول لے کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ کیلاش ان پھولوں کو اپنے گھروں اور مویشی خانوں میں سجاتے ہیں۔ کیلاش لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ان پھولوں کی وجہ سے گھر میں خوشحالی آئے گی۔ کیلاش پھولوں کو بہت پسند کرتے ہیں وہ یہ پھول اپنے رشتے داروں کو بھی تحفے کے طور پر دیتے ہیں۔

اسی دن شام کو دودھ اور پنیر وافر مقدار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کیلاش کسی الہامی کتاب کے پیروکار نہیں اور نہ ہی کسی نبی کو مانتے ہیں لیکن خدا کے نام پہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرتے ہیں۔ ”ہیر وڈوٹس“ نے ”تواریخ“ میں قدیم یونان کی جن رسوم کا ذکر کیا ہے یعنی انگور کا پانی اور موسم بہار کے تہوار اور بھیڑ بکریوں کی قربانیاں کرنا کیلاش بھی تقریباً ان رسوم سے ملتی جلتی رسوم اور رقص اس تہوار پہ ادا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ قوم قدیم یونانیوں سے مشابہ ہے۔

ساتک جوشی

ہم ہوٹل کے برآمدے میں کھڑے تھے ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی مکی اور باجرے کے کھیت لہلہا رہے تھے ندی کا شفاف پانی اٹھکھیلیاں کرتا ہوا بہہ رہا تھا پہاڑوں کی چوٹیوں پہ برف چمک رہی تھی۔ فضا میں پھولوں کی میٹھی میٹھی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ پائین گاؤں سے ڈھول کی مدھم آواز آرہی تھی اس نے بھی ماحول کو پراسرار بنا رکھا تھا۔

پھر ڈھول کی یہ آواز مسلسل ہمارے قریب آتی گئی سامنے والی سڑک پر درختوں کے جھنڈ سے ایک چھوٹا سا جلوس نمودار ہوا۔ سب سے آگے بوڑھے بزرگ تھے جنہوں نے لمبی لمبی لٹھیاں ہاتھوں میں پکڑ کر بلند کر رکھی تھیں اور خود بھی ناچ رہے تھے ان کے پیچھے نو جوان لڑکیاں تھیں۔ جنہوں نے سیاہ جعے نما لباس پہن رکھے تھے جن پر کشیدہ کاری کی ہوئی تھی اور ان کے چہروں پہ عجیب و غریب

نقش و نگار بنے ہوئے تھے ان کے پیچھے بڑی عمر کی عورتیں تھیں اور دوسرے مرد تھے ڈھول بے تھاشا پیٹا جا رہا تھا اور تمام لوگ بڑے جوش و خروش سے ناچ رہے تھے جو بوڑھے ہاتھوں میں لالٹیاں بلند کئے ہوئے تھے ان کے کانوں میں اخروٹ کی سبز ٹہنیاں اڑی ہوئی تھیں۔

شیر عالم نے بتایا کہ بوڑھے ہاتھوں میں نیزے نما لالٹیاں بلند کئے ہوئے ہیں یہ ”گنڈولک“ ہیں۔ کیلاش لوگوں میں گنڈولک کو ایک خاص مقام حاصل ہے کیونکہ یہ لوگ چرواہے ہیں ان لوگوں کو اپنے گاؤں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور گاؤں کے تمام فیصلے صرف چرواہا ہی کرتا ہے۔ کیونکہ چرواہا سخت محنت کرتا ہے۔ پورا پورا سال اپنے ریوڑ کے ساتھ پہاڑوں کی چوٹیوں پہ رہتا ہے اور دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ تجربہ کار ہوتا ہے اسی لئے ان کو گنڈولک کہتے ہیں۔ پھر یہ جلوس ناچتا گاٹا نیش گاؤں میں پہنچ گیا اور اس گاؤں کے تمام کیلاش اس جلوس میں شامل ہو گئے اور ہم عمر لڑکے اور لڑکیاں اپنا اپنا دائرہ بنا کر ناچنے لگے۔

اس کے بعد یہ جلوس برون گاؤں میں پہنچ گیا اس گاؤں کے لوگ بھی اسی طرح اس جلوس میں شامل ہو گئے۔ اب یہ جلوس کافی بڑا ہو گیا تھا۔ ہم بھی اس جلوس میں شامل ہو گئے۔ شاہ صاحب بھی جوش میں آ گئے اور ان کے ساتھ ناچنے لگے اور کیلاشوں سے خوب داد حاصل کی۔ اس طرح یہ جلوس بتریک گاؤں میں پہنچ گیا۔ بتریک ہی اس جشن کا مرکز تھا۔ دوسرے گاؤں سے بھی کیلاش اسی طرح ناچتے گاتے بتریک کے چھوٹے سے میدان میں اکٹھے ہو گئے۔

شیر عالم نے بتایا کہ لڑکیوں اور عورتوں نے چہرے پہ جو نقش بنا رکھے ہیں یہ ایک خاص قسم کی مرہم ہے جو کہ بکری کے سینگوں کو پتھر پہ رگڑ کر بنائی گئی ہے۔ اس سے چہرہ ملائم اور خوبصورت رہتا ہے اب شام ہونے کو تھی اور لوگ منتشر ہونا شروع ہو گئے اس رسم کا نام ہی ”ساتک جوشی“ ہے۔

”گونا جوشی“

ساتک جوشی سے اگلے دن گونا جوشی کی رسم ادا کی جاتی ہے جوشی سلسلے کا یہ تہوار خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ کیلاش اس دن ایک قسم کی اجتماعی عبادت کرتے ہیں۔ ساتک جوشی کی طرح اس دن بھی تمام کیلاش بتریک میں جمع ہو گئے۔ ہم عمر لڑکیاں اپنے اپنے دائرے بنا لیتی ہیں اور ہم عمر لڑکے ان کے گرد دائرہ بنا کر ناچتے ہیں۔ یہ رقص بڑے دھیمے انداز میں کیا جاتا ہے۔ ایک دوسرے کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر دائرے میں آہستہ آہستہ گھوما جاتا ہے اور ایک پاؤں آگے کر کے پھر پیچھے کیا جاتا

ہے۔

ہم ایک مکان کی دوسری منزل کی بالکونی میں بیٹھے یہ تماشا دیکھ رہے تھے بتریک کے اس چھوٹے سے سبزہ زار میں رنگ و نور کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ سیاہ لبادوں میں لپٹی ہوئی لڑکیاں بہت خوبصورت لگتی تھیں ان کے گلوں میں رنگ برنگے موتیوں اور منکوں کے ہار گلوں کے حساب سے تھے۔ سیاہ لبادوں پہ خوبصورت نیل بوٹے کڑھے ہوئے تھے۔ سروں پہ کوڑیوں اور بنٹنوں سے بنی ہوئی ٹوپیاں تھیں جو پیچھے کمر تک لگی ہوئیں تھیں۔ ماتھے پہ مرغ زریں کے پروں سے بنے ہوئے خوبصورت پھول لگے ہوئے تھے بعض لڑکیوں نے مور کے پروں سے بنے ہوئے پھول ماتھے پہ سجا رکھے تھے۔

بڑی بوڑھیوں نے اپنا قدیم روایتی لباس جو کہ بھیڑ کی سیاہ اون سے بنا ہوا تھا پہن رکھا تھا۔ ہر طرف سرخ سفید اور سیاہ رنگوں کی بہار نظر آرہی تھی۔ تمام چہرے مسکراہٹوں سے سجے ہوئے تھے بڑا دلکش سماں تھا۔

کچھ فرامیسی اور جاپانی لڑکیاں بھی کیلاشی لباس پہنے اور کیلاش لڑکیوں کی طرح میڈیاں بنائے ہوئے تھے۔ یہ لڑکیاں خاص طور پہ جوشی کا تہوار دیکھنے اور اس میں شامل ہونے کے لئے جاپان اور یورپ سے آئیں تھیں۔

تقریباً دو پہر کا وقت تھا کہ رقص روک دیا گیا۔ تمام عورتیں ایک بڑے سے ہال میں چلے گئیں اور باہر صرف مرد ہی رہ گئے۔ ایک گنڈولک نے اپنی چھری بلند کی تمام مرد اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ مارشل لاء خان نے بتایا کہ اب یہ تمام مرد اس گنڈولک کے ساتھ مل کر دعا مانگیں گے۔

اپنی قوم کی خیر خواہی اور بقا کے لئے تاکہ یہ لوگ اپنے رسم و رواج کے ساتھ ان وادیوں میں ہمیشہ زندہ رہیں۔ فصلیں اچھی ہوں، بھیڑ بکریاں تندرست رہیں۔ دبائیں اور زلزلے کیلاشوں کو نقصان نہ پہنچائیں۔

سنگھیک

جب مرد دعا مانگ رہے تھے تو عورتیں اپنے بچوں کو کندھوں پہ اٹھا کر ناچتی ہیں اور گاتی ہیں۔

کہ جو بچے چھوٹے تھے وہ جوان ہو گئے ہیں

اور یہ جو چھوٹے ہیں جلد جوان ہو جائیں گے

اپنے خاندان اور قوم کے لئے عظیم کارنامے

انجام دیں گے۔ چرواہے اور سردار بنیں گے

اس رسم کا نام سنگھیک ہے

کچھ گنڈولکوں نے اپنی چھڑیاں بلند کر رکھی تھیں۔ ڈھول بجنابھی بند ہو گیا۔ ایک بوڑھی عورت اونچی آواز میں رو رہی تھی اور بچن کر رہی تھی۔ بھٹو خان نے بتایا کہ اس بڑھیا کی بیٹی مسلمان ہو گئی ہے اور بڑھیا اس بات کا افسوس کر رہی ہے کہ نہ جانے میری بیٹی کو ہمارے مذہب کی کوئی بات ناپسند آئی ہے یا اس کی سہیلیوں اور رشتہ داروں نے اس کا دل دکھایا ہے کہ اس نے ہماری قوم میں ایک فرد کی کمی کر دی ہے۔ بھٹو خان نے بتایا کہ تمام کیلاش پریشان ہیں کہ ہماری تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے۔

اس وقت تمام کیلاش نو حہ کنناں تھے کہ کیلاش مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنا ایک فرد کے لئے تو اچھا ہو سکتا ہے لیکن مجموعی طور پر نقصان تمام کیلاشوں کا ہوتا ہے۔ کیونکہ نو جوان لڑکے اور لڑکیوں پر اس بات کا اثر ہوتا ہے کہ کیلاش مذہب شاید اچھا نہیں ہے جبکہ بوڑھے کیلاش بہت زیادہ غمزہ مند تھے۔

میٹوا کی جوشی

کیلاش وادیوں میں شہوت بھی کثرت سے پایا جاتا ہے آج جس جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں یعنی میٹوا کی جوشی یہ بھی جوشی کا ہی تہوار ہے۔

یہ تہوار شہوت پکنے کی خوشی میں منایا جاتا ہے۔ ان دنوں جو شہوت پکتے ہیں وہ انتہائی مزیدار اور شیریں ہوتے ہیں اس تہوار کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں صرف نو جوان لڑکیاں اور لڑکے ہی حصہ لیتے ہیں۔

برون گاؤں میں ہان کے پاس ہی چھوٹا سا میدان ہے لڑکیاں نیم دائرے میں ایک طرف کھڑی تھیں اور لڑکے دوسری طرف۔ پھر ایک لڑکے نے گانا شروع کیا۔

”اے مکھن جیسی سفید اور ریشم جیسی ملائم محبوبہ تو نے میرے لئے آزار بند کیوں نہیں بنایا جس کا تو نے وعدہ کیا تھا۔“

لڑکی گا کر یہی جواب دیتی ہے۔

”اے میرے محبوب میں نے تیرے لئے آزار بند بنانے کی بہت کوشش کی لیکن تیرے ظلم خیال نے مکمل ہی نہیں ہونے

دیا۔“

پھر دوسری لڑکی گاتی ہے۔

”اے میرے محبوب تو میرے لئے بیٹھے بیٹھے اور سفید سفید شہتوت لے کر کیوں نہیں آیا جس کا تو نے وعدہ کیا تھا۔“

دوسرا لڑکا جواب دیتا ہے۔

”اے معصوم محبوبہ! میں شہتوت توڑتا تھا تو وہ تیری زلفوں جیسی لمبی گھاس میں گر کر گرم ہو جاتے تھے اس لئے وعدہ پورا نہ کر سکا۔“

شیر عالم نے بتایا کہ اب لڑکے اور لڑکیاں مل کر خوب رقص کریں گے۔ دراصل یہ تہوار اس لئے ہوتا ہے کہ جن لڑکیوں کی لڑکوں سے بے تکلفی ہوتی ہے اور وہ محبت کے رشتے میں بندھے ہوتے ہیں وہ شادی کر لیں۔

چاؤ موس کے بعد اسی دن زیادہ شادیاں ہوتیں ہیں لیکن لڑکیوں کے والدین لڑکی کو جہیز جس میں بندوق، نیل یا بکریاں ہوتیں

ہیں وہ صرف چاؤ موس یعنی دسمبر میں ہی دیتے ہیں۔



وادی بمبوریت

جب سے ہم وادی میں آئے تھے مسلسل جوشی کے سلسلہ کے تہواروں ہی میں مصروف رہے۔ آج فیصلہ ہوا کہ وادی بمبوریت کی تفصیلی سیر کی جائے۔ وادی بمبوریت تقریباً پندرہ کلومیٹر لمبی ہے۔ وادی کے درمیان سے ندی گزرتی ہے ایک طرف ”سارک جو تھار اور گوری مون“ پہاڑوں کا سلسلہ ہے دوسری جانب گانوس اور کوھوم پہاڑ واقع ہیں۔

ہمارے گائیڈ ”شیر عالم“ مارشل لا خان، کرلی خاں اور نور شاہ تھے۔ وادی کے شروع میں ”پاکین“ گاؤں ہے اس کا سابقہ نام ”پاوالندے“ تھا اس گاؤں میں کیلاش لوگوں کے بہت تھوڑے گھر آباد ہیں۔ زیادہ مسلمان ہیں یہ ندی کے کنارے بہت خوبصورت گاؤں ہے۔ پورا گاؤں شاہ بلوط اور اخروٹ کے بڑے بڑے درختوں میں گھرا ہوا ہے۔

اس گاؤں کے گنڈولک کا نام بہرام شاہ ہے۔ وادی کے تمام قسم کے جشن اسی گاؤں کے گنڈولک بہرام شاہ سے رسمی طور پر اجازت لے کر شروع کئے جاتے ہیں۔

بہرام شاہ اپنی قوم کے بارے میں بہت فکرمند تھا کہ لڑکے بالے اپنے مذہب کی رسموں کا خیال نہیں کرتے۔ شہر والوں نے ان کے خیالات بدل دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ ”باتھن“ محترم شاہ بڑن اور چائی بھی اس گاؤں کے گنڈولک ہیں۔ یہ تمام لوگ بھی بہرام شاہ کی طرح اپنے مذہب کی بقا کے لئے کوشاں ہیں۔

ہمارے گائیڈ بھی چونکہ کیلاش تھے اس لئے اس گاؤں میں ہماری بہت آؤ بھگت ہوئی بہت سے بچے ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے۔ چوہدری صدیق نے ایک چھ سات سال کی بچی سے اس کا نام پوچھا تو اس نے اپنا نام بی بی سی (B.B.C) بتایا۔ کچھ گھروں سے ہمارے لئے اخروٹ کے تحفے بھی آئے۔ اس سے اگلا گاؤں تقریباً ایک کلومیٹر تھا۔ یہ انیو گاؤں تھا لیکن عام لوگ اسے انیش کہتے ہیں۔

شیر عالم اور دوسرے دوستوں کی وجہ سے اس گاؤں میں بھی لوگ بڑے احترام کے ساتھ ملے۔ شیر عالم نے اس گاؤں کے بڑوں سے ہمیں ملوایا۔ سوچائے ”غمنول“ مے شے فاشاروا لاک بال اور سوس خان یہ لوگ بھی چرواہے ہیں اور گاؤں کے تمام لوگ انکی عزت کرتے ہیں انیو گاؤں میں تقریباً تمام کیلاش لوگ ہیں۔

شیر عالم اور نور شاہ وغیرہ سے جب عورتیں ہاتھ ملا تیں تو شاہ صاحب بھی اپنا ہاتھ دیکھنا شروع کر دیتے اور مایوس ہو کر پھر پتلون کی جیب میں ڈال لیتے۔ کیلاش گاؤں تھوڑی بلندی پہ واقع ہیں اس لئے گاؤں سے نیچے وادی کا نظارہ بہت خوبصورت نظر آتا ہے اینرو سے ہم برون پہنچے۔ برون گاؤں وادی کے تمام گاؤں سے بڑا ہے اور عین وادی بمبوریت کے وسط میں ہے۔ اس گاؤں میں ہسپتال، ڈاکخانہ اور ہائی سکول بھی ہے۔ برون گاؤں میں ہی شیر عالم اور رحمت رحیم کے گھر ہیں۔ ہمارا ہوٹل بھی اسی گاؤں میں تھا۔ برون گاؤں میں مارشل لا خان کے گھر میں ہمارے لئے چائے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ارشد نے شیر عالم سے کہا کہ ہم ان گھروں کو اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

کیلاشوں کے گھر چھوٹے چھوٹے کمروں پہ مشتمل ہوتے ہیں۔ ایک کمرے کے درمیان میں چولہا یا آتشدان ہوتا ہے۔ یہی کمرہ سونے اور باورچی خانہ کے طور پہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایک کمرہ سنور کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور ایک مہمان خانے کے لئے ہوتا ہے۔

تمام کمرے اندر سے بالکل سیاہ تھے کیونکہ یہاں موسم سرما بہت طویل ہوتا ہے اور لوگ زیادہ وقت گھروں کے اندر ہی گزارتے ہیں۔ کمروں کے اندر چونکہ ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے اس لئے دھوئیں کی وجہ سے تمام کیلاشوں کے گھر اندر سے بالکل سیاہ ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کیلاش لوگ سال میں صرف ایک دفعہ اپنے گھروں کی صفائی کرتے ہیں۔

برون گاؤں میں بھی گاؤں کے بڑوں سے ہماری ملاقات ہوئی جن کے نام کچھ یوں ہیں۔ گاش، گوگئے، شارہ خان، چرمان، فشکاری، ہزار ملک، سون محمد، محمد خان، خوجک، ٹول شاردا، جگل وال، یہ تمام لوگ بھی چرواہے ہیں اور ان کو گاؤں اور وادی میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

”کیلاش قبرستان“

برون گاؤں میں ہی کیلاشوں کا قبرستان ہے۔ کیونکہ برون گاؤں وادی کے وسط میں واقع ہے اس لئے دوسرے گاؤں والے بھی اپنے مردے یہیں دفن کرتے ہیں جب ہم قبرستان میں پہنچے تو دیکھا کہ بہت سے لکڑی کے صندوق خستہ حالت میں پڑے ہیں۔ انسانی ہڈیاں بھی ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی چار پائیاں بھی پڑی ہوئی ہیں۔

ہمیں بتایا گیا کہ جب کوئی کیلاش مر جائے تو اسے نہلا کر صاف کپڑے پہنا دیئے جاتے ہیں اس کے سر پر ٹوپی بھی پہنائی جاتی ہے پھر اس کی میت کو ہان میں رکھ دیا جاتا ہے۔ ہان مختلف تقریبات اور مذہبی رسوم ادا کرنے کیلئے ایک بڑا ہال کمرہ ہوتا ہے۔ تمام

کیلاش مل کر اس کی میت کے گرد رقص کرتے ہیں۔ اس رسم میں وادی کے تمام کیلاش شریک ہوتے ہیں۔ مرنے والے کے قریبی عزیز تو خوب روتے ہیں لیکن دوسرے لوگ اس کی لاش کے گرد تین دن اور تین راتیں مسلسل رقص کرتے ہیں۔ سوگ میں شریک تمام لوگوں کے کھانے کا بندوبست مرنے والے کے گھر والے کرتے ہیں اس سوگ میں شریک لوگوں کے لئے تین دن تک بہت سے بکرے ذبح کرتے ہیں۔ اتنا خرچہ ایک شادی پر نہیں ہوتا جتنا کہ ایک آدمی کے مرنے پر کیا جاتا ہے۔

تین دن کے بعد میت کو قبرستان لایا جاتا ہے پہلے سے تیار شدہ صندوق میں اس کی لاش کو رکھ کر صندوق کو بند کر دیا جاتا ہے یعنی میت کو دفن نہیں کیا جاتا بلکہ اس صندوق نما تابوت کو پتھروں پر رکھ دیا جاتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ مرنے والے کی تمام اشیاء اور چار پائی بھی قبرستان میں ہی پھینک دی جاتی ہے۔

کھانے کی کچھ اشیاء اور پانی سے بھرا ایک کنوڑہ صندوق کے پاس رکھ دیا جاتا ہے ان کا عقیدہ ہے کہ مردے کی روح اگر کچھ کھانا چاہے تو یہیں سے کھالے۔ کیلاش عورتیں قبرستان میں سے بالکل نہیں گزر سکتیں ورنہ وہ نجس ہو جائیں گی۔ جب تک وہ ایک بکرہ ذبح کر کے خیرات نہیں کریں گی وہ کیلاش مذہب سے خارج سمجھی جائیں گی۔ قبرستان میں عورتوں کو مردوں سے الگ ایک کونے میں دفن کیا جاتا ہے ہم نے دیکھا کہ قبرستان میں کوڑیاں، گھنگھرو اور موتی بکھرے ہوئے ہیں کیونکہ مرنے والی عورت کے تمام زیورات اور کپڑے بھی قبرستان میں پھینک دیئے جاتے ہیں۔

اب مردوں کو زمین میں دفن کرنے کا رواج ہو گیا ہے لیکن مردے کی قبر نہیں بنائی جاتی بلکہ مردہ جس جگہ پر دفن ہو اس جگہ کے اوپر جس چار پائی پر مردے کو لایا جاتا ہے وہی الٹی کر کے رکھ دی جاتی ہے۔

جو عورتیں مخصوص ایام کے دوران مرجائیں تو ان کو انتہائی نجس سمجھا جاتا ہے اس کی تدفین میں مرد حصہ نہیں لیتے نہ ہی اس کی میت کے گرد ناچ کیا جاتا ہے۔ اس کو قبرستان کو ایک علیحدہ کونے میں عورتیں ہی دفن کرتی ہیں جس مرد کی بیوی فوت ہو جائے چالیس دن تک وہ کسی کے سامنے نہیں آتا۔

کیلاش لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جو کوئی بھی اس کو چالیس دن سے پہلے دیکھ لے گا وہ بیمار ہو جائے گا جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے وہ بھی ایسا ہی کرے گی۔

بشالینی

جب ہم مانوش دیکھنے جا رہے تھے تو پگڈنڈی سے ہٹ کر دائیں طرف ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ شیر عالم نے کہا کہ اب خاموش

ہو جائیں اور اس کمرے سے دور ہو کر گزریں۔ ہمارے پوچھنے پر شیر عالم نے بتایا کہ اس کا نام بشالینی ہے۔

جو عورتیں مخصوص ایام میں ہوتی ہیں وہ گاؤں یا گھر میں نہیں رہ سکتیں وہ اس ”بشالینی“ میں آ جاتی ہیں اس کے علاوہ جو عورتیں حاملہ ہوتی ہیں وہ بھی ایام زوجگی کے قریب اس مکان میں آ جاتی ہیں۔

”بشالینی“ میں جب عورتیں اپنے مخصوص ایام گزار لیتی ہیں تو وہ ندی پر جا کر کپڑے دھوتی ہیں اور نہاتی ہیں بالوں میں کنگھی کر کے گھر واپس آ جاتی ہیں جب کوئی لڑکی پہلی مرتبہ ”بشالینی“ جاتی ہیں تو عورتیں اس کو جلوس کی شکل میں ”بشالینی“ تک چھوڑنے آتیں ہیں اس ”بشالینی“ میں کچھ عورتیں گاؤں کی طرف سے دوسری عورتوں کی مدد کے لئے معمور ہوتی ہیں۔

شیر عالم نے بتایا کہ اس مکان کے قریب سے اگر کوئی گزرے تو یہ ”بشالینی“ بھی ناپاک ہو جائے گی اور گزرنے والا بھی ناپاک ہو جائے گا اور پھر جب تک وہ ایک بکرا ذبح کر کے تقسیم نہیں کرے گا تو پاک نہیں ہوگا۔ جو عورتیں ”بشالینی“ میں ہوتی ہیں ان کے لئے خوراک ان کے گھر والے ”بشالینی“ کے باہر پتھروں پر رکھ کر خاموشی سے واپس گھروں کو لوٹ آتے ہیں۔ ”بشالینی“ میں عورتیں اپنے دکھ، سکھ، اپنے راز اور اپنی پسند ناپسند کے بارے میں آپس میں گفتگو کر کے وقت گزارتی ہیں اور کوئی کام نہیں کرتیں۔

”ماٹوش“

”ماٹوش“ کیلاش لوگوں کے نزدیک انتہائی مقدس جگہ ہے یہ ایک چٹان پر لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر ٹب سا بنایا گیا ہے اور چاروں طرف پتھر چن دئے گئے ہیں دو لکڑیاں دونوں طرف کھڑی کی گئیں ہیں۔ ان لکڑیوں پر گھوڑے کے سربنائے گئے ہیں اوپر ایک تختے پر بکری کے بڑے بڑے سینگ لٹکے ہوئے ہیں یہ سینگ میں نے کئی گھروں میں اور جناح ہوٹل میں بھی لٹکتے ہوئے دیکھے۔ کیلاش لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جو کوئی ان سینگوں کو ہاتھ لگائے گا وہ آدمی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ یہ سینگ بہت مقدس سمجھے جاتے ہیں یہ گھر کی خیر و برکت اور بدروحوں کو بھگانے کے لیے لٹکائے جاتے ہیں۔

ہمیں بتایا گیا کہ اس ”ماٹوش“ پہ لوگ قربانیاں کرتے ہیں۔ ”ماٹوش“ کے قریب سے عورت بالکل نہیں گزر سکتی۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر عورت ”ماٹوش“ کے قریب آئے گی تو یہ ناپاک ہو جائے گا۔ دیوتا غضبناک ہو جائیں گے۔ جب کبھی بارش کا طوفان یا آندھی آتی ہے تو کیلاش لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی عورت ”ماٹوش“ کے قریب سے گزری ہے۔ اسلئے یہ طوفان باد و باراں آیا ہے۔ اس وقت کیلاش قربانیاں کرتے ہیں تاکہ دیوتا خوش ہو جائیں اور طوفان ختم جائے۔

”بیٹان“

ہمارے کیلاش دوست بھی آچکے تھے آج وادی بمبوریت کے باقی ماندہ گاؤں دیکھنے کا قصد کیا۔ ”بٹریک گاؤں“ میں شیر عالم کا ماموں رہتا ہے۔ شیر عالم نے بتایا کہ اس کا یہ ماموں ”بیٹان“ ہے۔

”بیٹان“ دراصل کیلاش لوگوں کا ایک مذہبی رہنما ہے جو کہ عام لوگوں کی طرح ہی زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ پشین گویاں کرتا ہے اور خوابوں کی تعبیر بھی کرتا ہے۔ شیر عالم کے ساتھ جب ہم اس کے ماموں کے گھر میں داخل ہوئے جو کہ ”بیٹان“ ہے تو وہ ایک برطانوی انگریز کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا اور بڑی روانی کے ساتھ انگریزی میں باتیں کر رہا تھا۔ شیر عالم نے بتایا کہ اس کا ماموں بالکل ان پڑھ ہے اور اس کی ساری عمر پہاڑوں پہ بکریاں چراتے ہوئے گزری۔ اس نے بتایا کہ انگریز اور برطانوی سیاح بڑی تعداد میں وادی میں آتے ہیں اور زیادہ تر یہ سیاح اسی کے ہاں ٹھہرتے ہیں۔ یہ ان کے ساتھ مختلف جگہوں پر گائیڈ کے طور پر بھی جاتا ہے اس لئے یہ انگریزی روانی سے بول سکتا ہے۔

جب بکرے کی قربانی دی جاتی ہے تو اگر کوئی بکرے کے خون کو دیکھ کر وجد میں آجائے اور بیہوش ہو جائے اور بے ہوشی کی حالت میں پشین گوئی کرے تو اسے ”بیٹان“ مان لیا جاتا ہے۔

شیر عالم کے ماموں نے بڑے احترام کے ساتھ ہمیں بٹھایا اور چائے پلائی۔ برطانوی انگریز سے تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ اس کا نام ”جان ہیرسن“ ہے اور یہ کیلاش لوگوں کے رسم و رواج پر ریسرچ کر رہا ہے۔ ”جان ہیرسن“ ایک خوش اخلاق آدمی تھا۔ اس نے بتایا کہ میں نے اب تک جو ریسرچ کی ہے کیلاش لوگوں کا تعلق سکندر اعظم سے بالکل ملتا ہے۔ ایک کیم شیم سیاہ پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک انگریز عورت اندر داخل ہوئی۔ ارشد نے جان ہیرسن سے پوچھا کہ کیا یہ آپ کی بیوی ہے؟ تو وہ خاتون مشتعل ہو گئی اور گالیاں بکنے لگی اس نے کہا ”ایک تو تم نے مجھے آنٹی کہا ہے اور یہ جان ہیرسن میرے دوست ہیں اور آپ نے مجھے اس کی بیوی بنا دیا۔“

یہ انگریز لوگ اب بھی اپنے آپ کو برصغیر کے لوگوں سے برتر سمجھتے ہیں اور اتنے مغرور ہیں کہ کسی مطلب کے بغیر کسی پاکستانی سے مکس اپ (MIX UP) ہونا پسند نہیں کرتے۔ میں نے اور اشرف کھوکھر نے بڑی مشکل سے اس خاتون کو ٹھنڈا کیا۔ صدیق اور ارشد بھی بہت غصے میں تھے کہ آخر ہم نے اسے کیا کہا ہے۔ ”آنٹی“ ہی تو کہا ہے۔

جان ہیرسن کی خوش اخلاقی میں اس واقعہ کے بعد بھی کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ اس نے بتایا کہ اس نسل کے اور اس طرح کے رسم و رواج سے ملتے جلتے کچھ قبیلے تھائی لینڈ میں بھی محدود تعداد میں آباد ہیں۔ تھائی لینڈ کا پرانا نام ”سیام“ ہے اس لئے کیلاش لوگوں کے

گیتوں اور لوگ کہانیوں میں سیام اور یونان کا ذکر عام ملتا ہے۔ ”جب بارشیں بہت زیادہ ہوں تو پھر عورتیں ایک گیت گاتی ہیں کہ اے خدا! تو ہم سے بمبوریت لے لے اور ہمارا سیام ہمیں واپس کر دے۔ کبھی یہ لوگ چترال سے لے کر اردو نندو اور افغانستان کے علاقے نورستان تک آباد تھے لیکن اپنی روایتی امن پسندی اور شرافت کی وجہ سے ارد گرد بسنے والی قوموں سے مغلوب ہو گئے۔ افغانستان کے علاقے نورستان میں ان کو زبردستی مسلمان بنالیا گیا اب یہ صرف ان تینوں وادیوں میں محدود تعداد میں اپنی نسل کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

شیر عالم نے بھی بتایا کہ ہمارے بڑے بوڑھے بتاتے ہیں 41-1940 کے درمیان یہاں سے بہت سے کیلاش لوگوں نے اپنے بہتر مستقبل کے لئے سیام اور یونان کی طرف ہجرت بھی کی تھی لیکن راستوں اور موسم کی دشواریوں کے باعث چترال وغیرہ کے گرد و نواح ہی میں کہیں مارے گئے اور آج تک ان کا سراغ نہیں ملا۔ جس کی تائید اس کے ماموں ”بیٹان“ نے بھی کی۔ ہم جان ہیرسن کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گئے اور سب نے مل کر اس انگریز خاتون کو ”آئنی بائے بائے“ کہا تو اس نے غضبناک نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

وہاں سے اونچے نیچے اور ٹیڑھے میڑھے راستوں سے ہوتے ہوئے تہریک گاؤں پہنچ گئے۔ وہاں ولی خان نامی ایک کیلاش نوجوان نے ہماری خوب آؤ بھگت کی۔ وہاں کے بڑوں سے بھی ہماری ملاقات ہوئی جن میں آملاخ، علی واس خان، عبدالملک، سورگت اور رام دین شامل تھے یہ تمام لوگ حکومت سے گلہ کر رہے تھے کہ حکومت اقلیت ہونے کی وجہ سے ہماری ترقی کی طرف دھیان نہیں دے رہی۔

باور رہے کہ وادی بمبوریت میں ”تہریک گاؤں“ موسم بہار کے تہوار ”جوشی“ کا مرکز ہے اور یہاں پر کیلاشوں کے کچھ مقدس مقامات بھی ہیں۔ تہریک کے بالکل نزدیک سے ایک صاف شفاف پانی کا نالہ تیزی سے گزرتا ہوا ندی میں جا گرتا ہے۔

”کڑکال اور شیخانندے“

ندی کے ساتھ ساتھ یہ کچار راستہ وادی کے تقریباً تمام گاؤں کے سامنے سے گزرتا ہے جس کو یہاں کے لوگ سڑک کہتے ہیں بہت سے نالے کئی جگہ سے اس کچے راستے کو قطع کرتے ہوئے ندی میں جا گرتے ہیں لیکن اس سڑک پر ان نالوں کے لئے کسی قسم کا بھی کوئی پل نہیں۔ ”شیخانندے“ کی طرف جاتے ہوئے یہ راستہ اوپر ہی اوپر اٹھتا جاتا ہے۔ ”تہریک“ سے تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر ”کڑکال“ کا خوبصورت گاؤں ہے یہاں کی تقریباً تمام آبادی کیلاش ہے۔ گاؤں کے سامنے ایک بڑا سا میدان ہے۔ گاؤں چونکہ

پہاڑ کے دامن میں واقع ہے اس لئے نیچے سے اوپر دیکھنے پر چھوٹے چھوٹے گھر بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ کڑکال گاؤں میں سلامت خان، خوجک، جنگل وال اور خوش آمد خان سے ملاقات ہوئی جو کہ اس قوم کے گنڈولگ ہیں۔

ہم کڑکال گاؤں سے تقریباً تین کلومیٹر چلنے کے بعد ”شیخانندے“ گاؤں میں پہنچ گئے۔ یہ بھی ایک خوبصورت گاؤں ہے یہاں سے ایک ندی نورستان کے پہاڑوں سے آتی ہے اور دوسری شاہ والا کی چوٹیوں سے اور یہ شیخانندے کے مقام پر خوبصورت سنگھم بناتی ہیں۔ شیخانندے کی تمام آبادی مسلمان ہے یہاں ایک خوبصورت مسجد اور فاریٹ ریٹ ہاؤس بھی ہے۔ یہ گاؤں بالکل افغانستان کی سرحد پر واقع ہے یہاں حکومت پاکستان کی طرف سے کچھ بورڈ وغیرہ بھی لگائے گئے ہیں کہ اس سے آگے جانا منع ہے۔ شیخانندے کے خوبصورت میدان میں بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا گیا اور واپسی کا قصد کیا۔

”سارک جوتھار کے گلشیر اور بلا لک“

صبح سویرے سب لوگ نہادھو کر تیار ہو چکے تھے لیکن اشرف کھوکھر ابھی تک سویا ہوا تھا۔ شیر عالم رات کو ہی ہمیں بتا گیا تھا کہ سارک جوتھار کے اوپر جو گلشیر نظر آرہے ہیں ان کے دوسری طرف ”وادی بریر“ ہے۔ کل آپ کو جنگل کی سیر بھی کرائیں گے اور وادی بریر کا نظارہ بھی۔ طے پایا تھا کہ پہاڑوں کے اوپر سے جنگل میں سے گزرتے ہوئے وادی بریر جائیں گے۔ شیر عالم نے اس مختصر سفر کے لئے بہت زیادہ تیاری کی تھی۔ اس نے پتلون اور جیکٹ پہن رکھی تھی کندھے سے کارتوسوں کی پٹی لٹک رہی تھی ایک تھیلے میں کھانے کیلئے کچھ خشک میوے اور بسکٹ تھے۔ دوسرے کندھے پر ”ٹائی گن“ کی طرح کی پرانی طرز کی بندوق تھی۔

اب اشرف کھوکھر کو جگانے کا مسئلہ تھا۔ اشرف کھوکھر میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو کہ ایک برے انسان میں ہونی چاہئیں۔ انتہائی کمینہ، خود غرض اور چہرے پہ مردنی چھائی ہو جیسے ابھی لمبی بیماری سے اٹھا ہو۔ ہر وقت کسی سوچ میں گم جیسے کسی کے بارے میں کوئی سازش سوچ رہا ہو۔ ٹھگنا ساقہ کہ اپنی انا کی آگ میں جل جل کر بالکل مختصر سا رہ گیا ہے کوئی بھی ڈرتا اسے جگانے کیلئے تیار نہ تھا۔ اشرف کو جگانے کا قریعہ میرے نام نکلا کیونکہ میں اس کی نفسیات سے کافی آگاہ ہوں اس لئے میں نے اپنا فرض بحسن خوبی ادا کیا اور چند منٹوں میں اشرف کھوکھر بھی تیار ہو کر ہمارے ساتھ تھا۔ شاہ صاحب نے پہاڑ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ پیشانی پہ موتی سے چمکنے لگے! کہنے لگا ”آپ جائیں میں یہاں براؤدے میں بیٹھ کر آپ لوگوں کو دیکھتا رہوں گا“

شیر عالم کی رہنمائی میں ندی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کچھ دیر بعد ہم ایک ندی پہ بنے ہوئے خستہ حال پل کے پاس پہنچ گئے اس پل اور پل صراط میں شاید تھوڑا بہت ہی فرق ہو۔ بہر حال جان جو کھوں میں ڈال کر اس کو عبور کیا۔ ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں

سے ہوتے ہوئے کوئی دو کلومیٹر کا سفر کیا ہوگا کہ سب لوگوں کے پسینے چھوٹ گئے اور سانس پھول گئے لیکن شیر عالم بالکل تروتازہ تھا۔ اب چڑھائی بالکل عمودی تھی اور راستوں کے نشان بھی بہت مدھم سے تھے کیونکہ ان راستوں سے کبھی کبھار چرواہے اپنے ریوڑ اوپر پہاڑوں پر لے کر جاتے ہیں۔ تھوڑا اوپر جانے کے بعد چند گھروں پہ مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں آیا۔ شیر عالم نے بتایا کہ اس گاؤں کا نام ہی ”سارک جو تھار“ ہے اس نے کہا آپ یہاں بیٹھ جائیں میں آپ کو اس گاؤں سے وابستہ بڑی عجیب و غریب کہانی سنا تا ہوں کہ وادی کے لوگ کہتے ہیں بہت عرصہ گزرا اسی ”سارک جو تھار“ گاؤں میں لومڑی کے قد کے لوگ رہتے تھے ان کے گھر کا سامان بھی انکی جسامت کی مناسبت سے تھا اور یہ مخلوق آدمیوں کی طرح ہی رہتی تھی۔ ان کو ”بلا لک“ کہتے تھے ان کی ایک منظم فوج تھی اور یہ مخلوق شور کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی اگر نیچے وادی کے لوگ کبھی لڑتے جھگڑتے یا شور مچاتے تو یہ بونے اپنی فوج لے کر وادی کے لوگوں پہ حملہ آور ہوتے تھے اور بونوں کی یہ فوج لمحوں میں وادی کے لوگوں کو چیر پھاڑ کے رکھ دیتے اور بڑی تیزی سے واپس آ کر اپنی کمین گاہوں میں چھپ جاتے اور وادی کے لوگ کبھی بھی اس طرف کا رخ نہیں کرتے تھے اب بھی مائیں اپنے شرارتی بچوں کو بلا لک کے نام سے ڈراتی ہیں۔

شیر عالم بار بار کہہ رہا تھا۔ ہاں یہ بالکل سچ ہے ناں یہ ایک بڑی خوبصورت تخیلاتی کہانی تھی لیکن ہم شیر عالم کی دل آزاری کرنا نہیں چاہتے تھے۔ تھوڑا سستانے کے بعد پھر چل دیئے اب جنگل اور گھنا ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے دیوبیکل چیز کے درخت تھے۔ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں جن میں سے راستہ بناتے ہوئے بڑی احتیاط سے اوپر جا رہے تھے کہ اچانک بڑا زوردار دھماکہ ہوا جیسے بم پھٹا ہو ہم دم بخود کھڑے ہو گئے۔ دھماکے کو فوراً بعد ایسا معلوم ہوا جیسے بہت سے درخت ٹوٹ رہے ہوں۔ جیسے بڑے بڑے پتھر لڑھکتے ہوئے ہماری جانب آرہے ہوں۔ میں نے دیکھا کہ سفید رنگ کے کئی کئی من وزنی گولے درختوں سے ٹکراتے ہوئے ہماری جانب آرہے ہیں لیکن ہم تک پہنچنے سے پہلے ہی چیز کے بڑے بڑے درختوں سے ٹکرانے کے بعد چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئے تمام لوگ سانس روکے ہوئے کھڑے تھے شیر عالم نے کہا کہ برف کا کوئی گلیشیر ٹوٹ کر گرا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ درختوں کی آڑ کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا ہے جب ہمارے حواس بحال ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ برف کے بڑے بڑے ٹکڑے تقریباً سو میٹر کے ایریا میں ہمارے ارد گرد پڑے تھے۔ شیر عالم نے کہا کہ چلو اوپر چلیں اب کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ یہ گلیشیر اتنا ہی تھا جتنا ٹوٹ کر گر گیا ہے۔

جب ہم ہوٹل سے سارک جو تھار کوہ کو دیکھ رہے تھے تو وہاں سے اس پہاڑ کی چوٹی پر باریک باریک سی چمکدار لکیریں دکھائی دیتی

تھیں تو یہ دراصل چھوٹے چھوٹے گلیشیر تھے جو سردیوں میں گرنے والی برف سے بنتے ہیں۔ کیونکہ اس علاقے میں درجہ حرارت بہت کم ہوتا ہے اس لئے یہ چھوٹے چھوٹے گلیشیر آئندہ سردیوں میں ہونے والی برف باری تک موجود رہتے ہیں لیکن اگر کبھی گرمی زیادہ پڑے تو یہ ایسے ہی ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ یہ گلیشیر بالتور و گلیشیر اور مش بروم گلیشیر جیسے تو نہیں ہوتے یہ صرف سوسودو سو گز کے ہوتے ہیں لیکن پہاڑوں کی چوٹیوں پر سارا سال رہتے ہیں۔ یہاں سے مزید اوپر چڑھنا شروع کیا اب چڑھائی بھی مشکل تھی اور نمی کی وجہ سے پاؤں بھی بار بار پھسل رہے تھے۔ تین گھنٹے مسلسل چلنے کے بعد ہم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے وہاں سے ارد گرد کا نظارہ بہت خوبصورت تھا۔ چوٹی پہ درخت نسبتاً چھوٹے قد کے تھے اور جنگل بھی گھنا نہیں تھا۔ وہاں پہ تازہ ٹہنیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ شیر عالم نے بتایا کہ یہ جتنی ٹہنیاں پڑی ہیں اتنے لوگ ادھر سے گزر رہے ہیں۔ اس نے بتایا کہ ہمارے ہاں یہ رسم ہے جو کوئی وادی بریر سے آتا ہے یا پھر وادی بمبوریت سے آتا ہے تو وہ درخت کی ایک ٹہنی توڑ کر یہاں ضرور پھینکتا ہے تاکہ جو کوئی ادھر سے گزرے اسے پتہ چل جائے کہ راستہ صاف ہے اس نے کہا یہاں چرواہے چکور اور دوسرے جانوروں کا شکار کرنے والے شکاری جڑی بوٹیاں تلاش کرنے والے مختلف سمتوں سے آتے ہیں۔ یہ ٹہنیاں انہی کی توڑ کر پھینکی ہوئی ہیں۔

ہم نے بھی اپنے اپنے حصے کی ایک ایک ٹہنی توڑ کر اس ڈھیر پر پھینکی اور کوہ سارک جو تھار کی عین چوٹی پہ بیٹھ کر خشک میوؤں اور بسکٹوں سے لُچ (Lunch) کیا۔

پہاڑ کی چوٹی سے جب ہم ارد گرد کا نظارہ کر رہے تھے تو آسمان کے مغربی افق پہ سنہرے اور گلابی بادل بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ اسوقت مجھے لیاقت اور طاہر بہت یاد آئے جو خوبصورت بادلوں کو بہت پسند کرتے ہیں انہیں بھی یہ وادیاں دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا لیکن اپنی کچھ مجبوریوں کی وجہ سے ہمارے ساتھ نہ آ سکے تھے۔ اتنے پیارے اور خوش ذوق دوستوں کو میں بہت مس کر رہا تھا۔ اب ہم جس جگہ کھڑے تھے یہاں چوٹی بالکل مخروطی تھی۔ سامنے وادی ”بریر“ تھی ماحول بڑا ہی پراسرار تھا۔ نیچے انتہائی خطرناک کھائیاں تھیں جن میں خاردار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں ان کھائیوں کے کنارے سے باریک سی پگڈنڈی وادی بریر کو جاتی تھی۔

اتنے تھک چکے تھے کہ وادی میں جانے کا اشتیاق بہت تھا اور کچھ لوگ وہاں ہمارا انتظار بھی کر رہے تھے لیکن اتنا خطرناک راستہ دیکھ کر ہمت جواب دے گئی۔

کوہ سارک جو تھار اور گوری مون کی چوٹیاں بالکل ساتھ ملیں ہوئیں تھیں کوہ گوری مون کی چوٹی سے وادی ”بریر“ بالکل صاف نظر

آ رہی تھی۔ وادی بریر وادی بمبوریت کی نسبت بہت چھوٹی ہے اس میں چھوٹے چھوٹے وہ گاؤں ہیں اور وادی بہت تنگ ہے۔ وادی کے وسط میں سے پارے کی طرح بے قرار ندی گزرتی ہے جو کہ ایون کے مقام پہ دریائے چترال میں گرتی ہے۔ وادی بریر میں جانے کے لئے ایون سے راستہ جاتا ہے۔ اس لئے وادی بمبوریت کے رہنے والوں کو پہلے ایون اور پھر ایون سے بریر جانا پڑتا ہے جبکہ زیادہ لوگ پہاڑ کے اوپر سے ہی پیدل آتے جاتے ہیں۔

اب واپس آنے کا مسئلہ تھا جب پہاڑ کی اترائی کو دیکھتے تو ہمت جواب دے دیتی۔ بہر حال واپس تو ہر حال میں آنا ہی تھا۔ شیر عالم نے واپسی کے لئے ایک دوسرا راستہ منتخب کیا جو کہ نسبتاً آسان تھا۔ بڑے بڑے تناور درخت ٹوٹے پڑے تھے۔ شیر عالم نے بتایا کہ یہ سب برف کے گلیشیروں کی وجہ سے ٹوٹے ہیں۔ ایک بڑے سے گلیشیر پہ بیٹھ کر تمام دوستوں نے تصویریں بنوائیں تاکہ سند رہے۔

تھوڑا نیچے آئے تو ایک چٹان میں بہت خوبصورت چمکدار پتھر کی قلمیں دھوپ میں چمک رہیں تھیں۔ سب لوگوں نے ان قلموں کو توڑ کر تھیلے میں رکھ لیا۔

راستے میں جگہ جگہ چرواہوں اور شکاریوں نے اپنے لئے غار سے بنارکھے تھے ان جنگلوں میں مرغ زریں، چکوزمینا، پاڑے اور کبھی کبھی برفانی چیتا بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ بلکہ برفانی چیتا کیلاشیوں کی بکروں کو بہت زیادہ نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ پہاڑ اور جنگل فطری حسن کا شاہکار ہیں۔

راستے میں کئی جگہ چشمے بھی دیکھے۔ جن کا پانی انتہائی ٹھنڈا اور فرحت بخش تھا۔ مشکل اترائیوں اور گھاؤں کا یہ سفر کافی رات گئے ختم ہوا۔ جب ہوٹل پہنچے تو شاہ صاحب خرائے لے رہے تھے البتہ دوسری چارپائی پر بیٹھے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

شاہ صاحب بھی جاگ گئے کہنے لگے یہ ابھی میں نے تھوڑی پہلے پکڑے ہیں ان کو کوئی جگہ نہیں مل رہی تھی اس لئے میں نے ان کو اپنے کمرے میں رات گزارنے کی اجازت دے دی ہے۔

شاہ صاحب نے تعارف کروایا کہ یہ جو ”کہونا“ سا چینٹ کی پھولدار شلوار پہنے بیٹھا ہے اس کا نام ”لم سمتھ“ ہے اس کا تعلق سڈنی سے ہے۔ اشرف کہنے لگا اس کی یہ حالت کس نے کی ہے۔ جیسے ابھی ابھی ”گڈ ڈکٹ“ جیسے پراسس سے گزرا ہے۔

دوسرے کا نام ”کرٹی“ ہے اور اس کا تعلق پمین سے ہے۔ صدیق صاحب کہنے لگے اگر ان کو لے ہی آئے تھے تو اب سوکیوں

رہے تھے۔ شاہ صاحب کہنے لگے دراصل میری انگریزی ختم ہو گئی تھی اس لئے مزید گفتگو کیسے کرتا۔

کرستی نے پوچھا شریف آدمیوں گرم پانی مل سکتا ہے تو ارشد نے کہا کیوں نہیں؟ کرستی نے پوچھا کہاں ہے تو ارشد نے کچن سے ایک خالی کنسٹر کرستی کے ہاتھ میں تھما دیا اور ندی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا وہاں سے یہ پانی کا بھراؤ اور پھر کچن میں چوہے پہ رکھ کر گرم کر لو۔

کرستی نے ایک فرلانگ دور ندی کی طرف دیکھا پھر چڑھائی کی طرف دیکھا اور کنسٹر رکھ دیا کہنے لگا بہت مشکل ہے صبح دیکھا جائے گا۔

آج شیر عالم کے گھر میں ہماری دعوت تھی۔ سب لوگ تیار ہو رہے تھے۔ شاہ صاحب لحاف میں لپٹے ہوئے گٹھڑی سے بنے بیٹھے تھے۔ لم سمٹھ اور ”کرستی“ اس کے سامنے موندب بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہ ان کو ہمارے تھیلے سے قلم نما پتھر نکال کر دیکھا رہے تھے۔ شاہ ان پتھروں کو بہت قیمتی بتا رہے تھے اور ان کی خصوصیات ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور جہاں بھول جاتے اردو میں بیان فرما رہے تھے۔ وہ دونوں بڑے رشک سے شاہ کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یہ اتنے قیمتی جواہر کے مالک ہیں۔ پھر نہ جانے شاہ کے دل میں کیا آئی کہنے لگا یہ تمام پتھر تم لے جاؤ میں تو مہم جو شخص ہوں وہاں سے اور لے آؤں گا۔ دونوں حیرانگی سے شاہ کو دیکھنے لگے۔ شاہ نے تمام پتھر اٹھا کر ان کی جیبوں میں ڈال دیئے۔

جب وہ چلے گئے تو شاہ کہنے لگا یار یہ تو ہمارے مہمان تھے۔ آپ کل جا کر پھر وہاں سے لے آنا۔ اتنے میں ہوٹل کا مالک مسٹر جناح بھی آ گیا کہنے لگا یہ پھانس ادھر سے گیا ہے۔ ہم نے پوچھا کہ یہ پھانس کیا ہوتا ہے۔ مسٹر جناح نے کہا کہ یہ انگریز پھانس ہی ہے ناں۔

شاہ نے کہا کہ یہ ”فارز“ کہہ رہا ہے۔ مسٹر جناح نے کہا یہ تمام پھانس لوگ ہمارے ہوٹل کو بہت پسند کرتا ہے ناں۔ ادھر پھانس بی بی بھی آتا ہے ناں۔ شاہ نے مسٹر جناح کی پھانس بی بی کا ترجمہ کیا کہ یہ انگریز عورتوں کو یہ خطاب دے رہا ہے۔ اتنے میں شیر عالم ہمیں لینے کے لئے پہنچ گیا۔ شیر عالم کا گھر ندی کی دوسری جانب تھا اس لئے ندی کو پار کرنے کے لئے ”پل صراط“ قسم کے پل سے گزرنا پڑا۔

جب شاہ پل کے درمیان میں آیا تو زور و شور سے بہتے ہوئے پانی کی طرف دیکھا تو بے دل سا ہو کر فوراً بیٹھ گیا۔ بڑی مشکل سے شاہ کو گھسیٹ کر پل کی دوسری جانب لایا گیا۔ شاہ پسینے میں تر ہوا تھا اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ شیر عالم کا گھر خوبصورت سبزہ زار میں

واقع ہے۔ چاروں طرف مکئی اور باجرے کی ہری بھری فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ گھر کے صحن میں سیب اور خوبانیوں کا باغ لگا ہوا تھا۔ باغ کے ان درختوں پر لگے ہوئے پھل بڑے بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ گلاب کے مختلف رنگوں کے پھول گھر کے چاروں طرف لگے ہوئے تھے۔ ماحول میں پھلوں اور پھولوں کی خوشبو نے ایک سحر ساطاری کر رکھا تھا۔ اس سبزہ زار کے درمیان میں دو کمروں اور ایک برآمدے پہ مشتمل یہ چھوٹا سا گھر فردوس بریں کے ایک گوشے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ مکان کے دونوں طرف دو بڑے بڑے شہتوت کے درخت تھے جنکے ساتھ انگور کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں اور انگوروں کے بڑے بڑے خوشے لٹک رہے تھے۔

یہ جگہ کیونکہ عین ندی کے کنارے واقع ہے اور ندی کا پانی بڑی تیزی سے پتھروں کے ساتھ ٹکرا کر اچھلتا کودتا تھا تو کبھی کبھی ہلکی سی پھوار اس سبزہ زار میں بھی گرتی تھی بڑی ہی دلفریب اور دلکش جگہ تھی اسی سبزہ زار پہ نئی نئی چٹانیاں بچھا کر ہماری دعوت کا انتظام کیا گیا۔

شیر عالم کی والدہ اپنے روایتی خوبصورت لباس میں تھی۔ شیر عالم کے بڑے بھائی اور بھابھی نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ شیر عالم کی والدہ نے تمام لوگوں کے ساتھ مصافحہ کیا۔ تمام لوگوں کے گلے میں خشک میوؤں کے ہار ڈالے اور اپنی زبان میں ہمیں دعائیں دیتی ہوئی ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

ہم صرف انکے چہروں پہ بکھری ہوئی خوشی سے جان گئے کہ ان لوگوں کے دلوں میں ہمارے لئے کتنا خلوص اور محبت ہے۔ کھانے کے بعد ناشپاتیاں، سیب اور خوبانیاں پیش کی گئیں۔ اس کے بعد خشک میوؤں اور چائے سے تواضع کی گئی۔

شیر عالم نے بتایا کہ ہر کیلاش خاندان کے دو گھر ہوتے ہیں ایک موسم سرما کے لئے اور ایک موسم گرما کے لیے۔ اس نے بتایا کہ یہ ہمارا موسم گرما کا گھر ہے اور جب برفباری شروع ہو جائے گی تو پھر ہم ”مانوش“ کے قریب والی آبادی میں منتقل ہو جائیں گے۔ اس سبزہ زار کے ایک طرف بالکل ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ شیر عالم نے بتایا یہ پھلوں کے لئے سنور ہے۔ یہ خاص تکنیک سے بنایا جاتا ہے یہ تھوڑا سا زمین کے اندر ہوتا ہے اور تھوڑا سا باہر۔ اگست میں تمام پھل توڑ کر اس سنور میں رکھ دئے جاتے ہیں۔

اگر سارا سال پھل اس کے اندر پڑے رہیں تو بالکل تروتازہ رہتے ہیں اور بالکل خراب نہیں ہوتے۔ شیر عالم نے بتایا کہ کیلاش سال میں صرف ایک مرتبہ گھر کی صفائی کرتے ہیں لیکن میں اپنے گھر کی صفائی روزانہ کرتا ہوں۔ اس لئے شیر عالم کا یہ گھر پوری وادی میں مثالی گھر ہے۔

اتنی خوبصورت جگہ کو چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا بہر حال پچھلے پہر ہم ان کے گھر سے واپس آئے۔ ندی کے کنارے درختوں

کے ایک جھنڈ میں کچھ لڑکیاں بانسری بجا رہی تھیں۔ شیر عالم نے بتایا کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے شہری لوگ کبھی کبھی پنک مناتے ہیں یہ لڑکیاں اپنی ہم جولیوں کے ساتھ ایسے ہی پنک منا رہی ہیں۔

شیر عالم نے بتایا کہ آج تک کوئی آدمی وادی میں قتل نہیں ہوا اور نہ ہی کیلاش زبان میں کوئی فحش گالی ہے۔ چھوٹے موٹے جھگڑے ہم لوگ خود ہی نمٹا لیتے ہیں بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچے۔

ان خوبصورت وادیوں میں لوگ اپنے محدود وسائل کے ساتھ زندگی سے بالکل مطمئن نظر آتے ہیں۔ البتہ جو نو جوان وادی سے باہر جا کر بڑے شہروں میں کام وغیرہ کرتے ہیں ان میں کافی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ شیر عالم نے بتایا کہ چونکہ ان کے پاس زمینیں بہت تھوڑی تھوڑی ہیں اس لئے کام بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ بڑے بوڑھے پہاڑوں کے اوپر چراگا ہوں میں بھیڑ بکریاں چراتے ہیں۔ نو جوان سیر و شکار اور عشق بازی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ زیادہ وقت کھیل کود میں ضائع کرتے ہیں۔ عورتیں کھیتوں میں آدمیوں کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں یا پھر گھروں میں بیٹھ کر کڑھائی سلائی کرتی ہیں۔ مندے اور چٹائیاں بنتی ہیں اور مل بیٹھ کر لوک قصے کہانیاں سناتی ہیں اور یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے پنجاب میں کبھی ”ترنجن“ ہوتا تھا۔

قدرت نے اس وادی کو جتنا حسن بخشا ہے وہ تو بے حساب ہے لیکن ان کی غربت انتہا تک ہے ان لوگوں کو گلہ ہے کہ ایون کے مسلمانوں نے ان کی غربت سے فائدہ اٹھا کر بہت سی زمینیں اور اخروٹ کے درخت معمولی رقم کے عوض ہتھیا لئے ہیں۔ ہم ان کے دکھ میں شریک تو ہو سکتے تھے لیکن اس دکھ کا مداوا نہیں کر سکتے تھے۔

پنجابی کے شاعر ظہور حسین ظہور نے وادی بمریت پہ شاندار نظم لکھی ہے جس میں ظہور نے وادی کے حسن اور منظر نگاری بہت ہی خوبصورت انداز میں کی ہے

چار چوہیرے اچے پر بہت ادھ وچکار کھلی بمریت
پتھراں وچوں دودھ سدا اے ہسن ہواواں ٹھنڈیاں سیت
قدرت دے اُمول خزانے پل پل رہن نگاہواں اگے
میریاں سوچاں کالیاں لگن ساویاں ساویاں تھانواں اگے
پتلیاں پتلیاں پگڈنڈیاں تے جیویں کچلے دی دھار بریک
رب نے انج تصویر بنا کے مار دتی پتھر تے لیک

اپنے آپ لٹاؤں موتی پانی اتے سپیاں تریاں
 بوٹے بوٹے حسن اخیراں پوٹے پوٹے جادوگریاں
 اک اک چوٹی بن کے ووہٹی اپنے وال کھارے کھولے
 قدرت چٹے پتھراں اتے سادے سادے پھمن ڈوہلے
 چٹیاں برفاں آل دوالے مچدے پھردے روں دے گولے
 سنبھل ٹریے تلیاں تھبکن راہ پیندے گھاہ پولے پولے

ظہور کی نظم کے یہ منتخب شعر ہیں۔ یقیناً یہ اشعار وادی بمبوریت کی خوبصورت منظر نگاری پیش کرتے ہیں۔

شاعر کہہ رہا ہے کہ وادی کے چاروں طرف اونچے اونچے سرسبز پہاڑ ہیں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ وادی میں بہنے والی ندیوں کا دودھ کی طرح کا میٹھا اور شفاف پانی پتھروں سے نکل کر آتا ہے اور وادی میں چلنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ماحول کو مزید سحر انگیز بناتی ہیں۔

ایسے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اپنا تمام حسن اس وادی پہ نچھاور کر دیا ہے وادی میں سبزہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کے مقابلے میں میرے خیالات بہت کم ہیں کہ قدرت نے ان پہاڑوں اپنی تمام صفائی ان پتھروں پہ کندہ کر دی ہے۔
 پہاڑوں کی چوٹیاں ایسے معلوم ہوتی ہیں کہ جیسے نئی نویلی دلہن نے اپنے گیسو کھول کر پھیلا رکھے ہوں اور قدرت نے سفید پتھروں پہ سرسبز پھول نچھاور کر رکھے ہوں۔ وادی میں سفید برف بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے اور روئی کے گالوں جیسے بادل وادی پہ رقص کر رہے ہیں۔ اس برف پہ چلنے سے پاؤں کو ایک سکوں سا محسوس ہوتا ہے اور نرم نرم گھاس پاؤں کی تھکاوٹ دور کر دیتی ہے۔



”وادی رمبور“

مئی کی یہ صبح انتہائی خوبصورت تھی سنہری شفق نے پہاڑوں پہ سبزے کو مزید سبز کر رکھا تھا۔ کالے سیاہ بادل شمال کی طرف چھائے ہوئے تھے۔ ہم ہوٹل کے برآمدے میں بیٹھ کر چائے پی رہے تھے تو مسٹر جناح آگئے تمام لوگوں نے مسٹر جناح کے ساتھ ”شپاتہ“ کیا کیلاش لوگوں کی رسم کے مطابق کسی کو سلام کرنا اور گلے ملنا ”شپاتہ“ کہلاتا ہے۔

مسٹر جناح نے کہا کہ آپ تیار ہو جائیں آپ کو وادی رمبور جانا ہے۔ شیر عالم ابھی دوسرے انتظامات مکمل کرنے گیا ہے بس وہ آیا ہی چاہتا ہے۔ یہ پروگرام شیر عالم اور اس کے دوستوں نے خود ہی بنایا تھا اتنے میں شیر عالم آگیا اس نے بتایا کہ باہر جیپ تیار کھڑی ہے۔ صرف اپنے کمرے ساتھ لے لیں اور چلیں۔

جیپ بالکل چھوٹی سی تھی اور لوگ زیادہ تھے۔ شیر عالم کے بہت سے دوست بھی اس کے ساتھ تھے وہ کیلاشی زبان میں شیر عالم کو مخاطب کر کے اسے کچھ مذاق وغیرہ کر رہے تھے اور شیر عالم شرمائے جا رہا تھا۔

چوہدری صدیق ڈاکٹر ارشد چوہدری اشرف کھوکھر اور مجھے تو انہوں نے سیٹوں پہ بٹھادیا اور دوسرے تمام لوگ جیپ میں کھڑے ہو گئے۔ ”ودباش“ ہی کے مقام سے ایک راستہ وادی رمبور کو جاتا ہے یہ تنگ سا راستہ ندی کے ساتھ ساتھ انتہائی دشوار گزار ہے بہر حال تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وادی رمبور سے چار پانچ کلومیٹر پیچھے ہی اتار دیئے گئے۔ یہاں سے ہمیں پیدل جانا تھا کیونکہ کئی سال پہلے یہاں سے سڑک سلائڈنگ کی وجہ سے ٹوٹ چکی ہے اور جیپ اس سے آگے نہیں جاسکتی۔

میں نے مارشل لا خان سے پوچھا کہ آپ لوگ شیر عالم کو کیسے مذاق کر رہے ہیں اس نے بتایا کہ دراصل شیر عالم کی محبوبہ بھی اس جشن میں موجود ہوگی جو کہ آج وادی رمبور میں چلم جوشی کے سلسلہ میں ہو رہا ہے۔

شیر عالم اور اقلاس بی بی کا فسانہ عشق کیلاش وادیوں میں بہت شہرت حاصل کر چکا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شیر عالم اور اقلاس بی بی جو کہ کیلاشوں میں واحد لڑکی ہے شیر عالم کے ساتھ سکول میں پڑھتی ہے۔ حالانکہ رسم یہ ہے کہ جو لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو پسند کریں ان کی شادی ضرور ہو جاتی ہے۔ شیر عالم رسم کے مطابق اقلاس بی بی کو بھگا کر اپنے گھر بھی لے جا چکا ہے لیکن اقلاس بی بی کا والد بشیر خاں جو کہ وادی رمبور کے بڑوں میں سے ایک ہے وہ مسلسل انکار کئے جا رہا ہے کیونکہ اس کی بیٹی اقلاس بی بی تینوں وادیوں میں واحد

کیلاش لڑکی ہے جو میڑک پاس ہے اس لئے شیر عالم اور اقلاس بی بی کی شفاف محبت میں سماج کی ظالم دیوار بنا ہوا ہے۔

تو مجھے یاد آیا کہ شیر عالم نے ایک دفعہ اپنے اس عشق کا احوال مجھے بتایا تو تھا۔ مسٹر جناح نے بھی مجھے بتایا تھا کہ کیلاش معاشرے میں لڑکے اور لڑکی کی پسند کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن نہ جانے کیا وجہ ہے کہ بشیر خان اپنی ضد پہ قائم ہے جبکہ یہ دستور کے خلاف ہے۔

لیکن شیر عالم بھی اپنے فیصلے پہ قائم ہے جبکہ اس کی والدہ اور تمام رشتے دار اس کو قائل کرنے کی کوشش کر چکے ہیں کہ وہ کہیں اور شادی کر لے۔ اس طرح شیر عالم کا عشق واقعی ہی کیلاش تاریخ کا سب سے بڑا عشق ہے۔

ہمارا یہ چھوٹا سا قافلہ تھوڑی ہی دیر میں وادی رمبور کے پہلے گاؤں ”پرکا لک“ میں پہنچ گیا۔ ”پرکا لک“ چند گھروں پہ مشتمل چھوٹا سا گاؤں ہے۔ گاؤں میں کوئی فرد نظر نہ آیا۔ صرف دو تین بچے اخروٹ کے بڑے بڑے درختوں کے نیچے کھیل رہے تھے۔ رحمت رحیم کی بہن کا گھر بھی اسی گاؤں میں ہے۔ رحمت رحیم نے بتایا کہ تمام لوگ کھیتوں میں کام کرنے گئے ہوئے ہیں۔

تقریباً ایک کلومیٹر آگے ”کوٹ دلش“ گاؤں آیا یہ بھی پہلے گاؤں کی طرح چھوٹا سا گاؤں ہے۔ ندی کا موڑ مڑتے ہی ہم ”بالا دلش گاؤں“ میں پہنچ گئے وادی رمبور کا آخری گاؤں ”شی گالا“ ہے۔

شی گالا ایک خوبصورت گاؤں ہے یہ پہاڑی کے دامن میں واقع ہے اور یہ گاؤں دوسرے تمام گاؤں سے بڑا ہے یہی ہماری منزل تھا۔

شیر عالم کا دوست ”قائد اعظم“ جو کہ دسویں جماعت کا طالب علم تھا ہمارے استقبال کے لئے اپنے دوستوں کے ساتھ گاؤں کے باہر ہی آیا ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ تمام رمبور کے دوستوں نے شپا تہ کیا۔ قائد اعظم کا گھر ندی کے موڑ کے ساتھ ایک بڑی سی چٹان پر واقع ہے جو کہ تقریباً سو فٹ بلند ہے۔

شمال مشرق کی طرف کے پہاڑوں سے شفاف پانی کی ندی بہتی ہوئی ”قائد اعظم“ کے گھر کے بالکل نیچے سے گزرتی ہے۔ اوپر سے نیچے کا نظارہ بڑا دل فریب ہے۔ قائد اعظم کے گھر میں مکی کی روٹی پنیر اور چائے کے ساتھ ہماری تواضع کی گئی۔ اتنے میں قائد اعظم کا بڑا بھائی محمد منیر شیر عالم کے لئے اقلاس بی بی کا پیغام لے کر آ گیا۔

قائد اعظم نے بتایا کہ وادی رمبور میں موسم بہار کا جشن جوشی وادی رمبوریت اور بریر سے دودن پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وادی رمبور شمال مشرق کی سمت ہونے کی وجہ سے سورج زیادہ دیر وادی کے سامنے رہتا ہے۔ اس لئے پھول دودن پہلے کھل جاتے

ہیں اور پھل بھی وادی رمبور میں دو تین دن پہلے پک جاتے ہیں۔

قائد اعظم کے گھر سے ایک گھاٹی پہ سے گزر کر مرزید سوٹ اوپر آئے تو یہاں میلے کا سماں تھا۔ وادی کے تقریباً تمام لوگ یہاں جمع تھے اور یہیں پہ وادی کا ڈانس ہال تھا۔

ڈھول بج رہا تھا ہر عمر کی عورتیں اور مرد ڈھول کی تھاپ پر ناچ رہے تھے تمام لوگ اجلے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور بہت خوش نظر آرہے تھے۔

ہمارے میزبانوں نے ہمیں رقص گاہ کے سامنے ایک بڑے پتھر پر بٹھا دیا۔ ہم پانچوں کے علاوہ کچھ یورپی اور جاپانی لوگ پہلے سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ قائد اعظم نے بتایا کہ کیلاشوں میں رواج ہے کہ جب کسی کیلاش لڑکے کو دوست اس کی محبوبہ کے گاؤں جائیں تو اس کی محبوبہ انکے ہاتھ چوم کر آنکھوں کو لگاتی ہے۔

شاہ اور صدیق چوہدری اس بات سے بہت خوش ہوئے لیکن ان کی امیدوں پر اسوقت پانی پھر گیا جب ان کو بتایا گیا کہ اقلاس بی بی شیر عالم کے ناکام عشق کی وجہ سے ان کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی۔ رقص گاہ میں جوشی تہوار شروع ہو چکا تھا نو جوان لڑکیاں اپنی ہجولیوں کے ساتھ ایک دھیمادھیمارقص کر رہی تھیں۔ بڑی بوڑھیاں اپنا الگ دائرہ بنائے ہوئے تھیں۔ چھوٹی عمر کی بچیاں علیحدہ رقص کر رہی تھیں۔ لاابالی سے کیلاش نو جوان ہاؤ ہو کرتے ہوئے ان کے گرد منڈلا رہے تھے۔ بڑے بزرگ برچھی نما لٹھیاں بلند کئے کچھ اپنا ہی الاپ شلاپ بڑبڑا رہے تھے۔

پھر آہستہ آہستہ ڈھولکی تھاپ تیز ہوتی گئی رقص بھی تیز ہوتا گیا۔ بڑا ہی ولولہ انگیز اور پر جوش ناچ تھا۔ قائد اعظم نے ہمیں بتایا کہ وہ سامنے جو نو جوان لڑکیوں کی ٹول ہے اس میں جو سب سے خوبصورت لڑکی ہے وہی اقلاس بی بی ہے تمام کی نظریں اقلاس بی بی پہ جم گئیں۔

اقلاس بی بی کا لباس دوسری تمام کیلاش لڑکیوں سے خوبصورت تھا اس کی کمر کی پیٹی بھی دوسری لڑکیوں سے بہت زیادہ خوبصورت بنی ہوئی تھی اور اس کے سر کے پھول میں سے زیادہ مرغ زریں کے پر تھے۔ اقلاس بی بی اس مجمعے میں نمایاں تھی اس کے چہرے پہ معصومیت اور حسن کا عجیب سا تقدس تھا۔ ہم شیر عالم کے انتخاب کی داد دئے بغیر نہ رہ سکے۔ چوہدری صدیق اور شاہ صاحب جوش میں آگئے اور سب نے مل کر بھابھی زندہ باد کا نعرہ بلند کیا۔

رقص گاہ کے تمام لوگوں کی توجہ ہماری طرف ہو گئی اور وہ ہاتھ ہلا کر جیسے ہمیں بتا رہے تھے کہ ہم بھی آپ کے نعرے میں

شریک ہیں۔ رقص کرتی ہوئی لڑکیوں میں ایک لڑکی جاپانی بھی تھی۔ قائد اعظم نے ہمیں بتایا کہ اس جاپانی لڑکی کا نام ”ایکو“ ہے اور اس لڑکی نے کیلاش تہذیب و تمدن ثقافت مذہب اور رسوم رواج سے اتنا عشق کیا ہے کہ جاپان کو چھوڑ کر جہاں زندگی کی تمام سہولتیں میسر ہیں اس جنگل بیابان میں ایک کیلاش لڑکے سے شادی کر رکھی ہے۔ یہی کیلاش لباس پہنتی ہے۔ کیلاش زبان بولتی ہے اور تمام کیلاشی رسم و رواج کو اپنارکھا ہے۔

پھر اچانک رقص روک دیا گیا ایک بوڑھا چرواہا ہاتھوں میں لالٹھی بلند کر کے اونچی آواز میں بولنے لگا اور تمام لوگ توجہ سے سننے لگے۔ قائد اعظم نے بتایا کہ یہ بوڑھا اپنے آباؤ اجداد کی تعریف کر رہا ہے۔ جنہوں نے کیلاشوں کے لیے عظیم اور شاندار کارنامے انجام دیئے۔ کیلاشوں کے لئے رسم و رواج بنائے اور ان کی بنیاد خلوص رواداری اور محبت پر رکھی۔

اب دوسرے کیلاش بھی اس دعا میں شریک تھے۔ دعا کے خاتمہ پر پھر اجتماعی رقص شروع ہوا۔ تمام عورتیں لڑکیاں اور بچیاں ایک دوسرے کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر ایک بڑے دائرے میں رقص کرنے لگیں۔

بھابھی اقلاس بی بی بھی کبھی کبھی نظر چرا کر ہماری طرف دیکھ لیتی جیسے کہ وہ التجا کر رہی ہو کہ میں مجبور ہوں ورنہ میں آپ کی بہت خدمت کرتی کیونکہ آپ شیر عالم کے دوست ہیں۔

ہم اس ناچ تماشے سے بہت محظوظ ہوئے لیکن مجھے معلوم تھا کہ شیر عالم انگاروں پہ لوٹ رہا ہے اور کافی سنجیدہ نظر آتا تھا۔ اچانک گھنگور گھٹائیں چھا گئیں اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ ہم قائد اعظم اور شیر عالم کی رہنمائی میں ایک محفوظ راستے سے قائد اعظم کے مہمان خانے میں واپس آ گئے۔

اسی راستے میں ایک لکڑی کا خستہ سا مجسمہ اسٹادہ تھا جو کہ تقریباً ٹوٹ چوٹ چکا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کافی پرانا ہے۔ شیر عالم نے بتایا کہ یہ ایک عظیم آدمی کا مجسمہ تھا جس نے اپنی قوم کے لئے کئی شاندار کارنامے انجام دیئے۔

یہ مجسمے صرف عظیم آدمیوں کے ہی بنائے جاتے تھے اور ان مجسموں پہ سال میں ایک دفعہ اس عظیم آدمی کے رشتہ داروں کی طرف سے ایک بہت بڑی دعوت بھی دی جاتی تھی اور اس قسم کے مجسمے عام گزرگاہ کے قریب نصب کئے جاتے تھے اور ہر سال ان کے گرد خوب رقص کیا جاتا تھا لیکن اب یہ رسم تقریباً ختم ہو گئی ہے۔



شاہ بلوط کے جھنڈ میں پروسیسوں کی بستی

وادی بہوریت میں یہ ہماری آخری رات تھی۔ شیر عالم کے گھر سے ہمارے لئے ایک موٹا تازہ بکرا آیا ہوا تھا جو کہ ہوٹل کے برآمدے میں ایک ستون کے ساتھ بندھا ہوا منمنار ہوا تھا۔

شیر عالم نے کہا کہ آپ ہمارے ہاتھ سے کیا ہوا ذبیحہ نہیں کھاتے اس لئے میری والدہ نے یہ بکرا آپ کے لئے بھیجا ہے۔ اس کو آپ خود ہی ذبح کریں اور خود ہی اپنی مرضی سے اس کا گوشت پکائیں۔ ہوٹل کی پچھلی جانب شاہ بلوط کے درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ تھا۔ اشرف نے مشورہ دیا کہ اس بکرے کو وہیں ذبح کیا جائے اور وہیں بیٹھ کر پکا یا جائے۔

تمام لوگوں نے اشرف کی تجویز کو پسند کیا۔ بکرے کو جلوس کی شکل میں شاہ بلوط کے جھنڈ میں لایا گیا اب بکرے کو ذبح کرنے کا مسئلہ تھا۔ اشرف نے کہا یہ کونسا مشکل کام ہے بکرے کو شیخ کرز میں پے دے مارا اور چھری اس کی گردن پر چلا دی اور شاہ بلوط کے درخت کی ایک موٹی ٹہنی کے ساتھ الٹا لٹکا کر بڑی صفائی سے کھال اتار دی۔

اشرف کھوکھر ایک ہرفن مولا شخص ہے اور بنیادی طور پر ایک ہنرمند خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اپنے پورے خاندان میں صرف اشرف کھوکھر کو ہی یہ اعجاز حاصل ہے کہ پوری دس جماعتیں پاس ہے۔

اشرف کھوکھر کی المیہ کہانی فیصل آباد میں ”ہیومن گائیڈز“ کے بانی ”باباجی اقبال“ کی کہانی سے ملتی جلتی ہے۔ ایک دن باباجی اقبال کے دفتر میں ان سے ملنے گیا تو انہوں نے ایک رسالے کے سرورق پہ ایک بزرگ کی تصویر دکھائی کہ یہ میرے دادا جان کی تصویر ہے۔

باباجی نے فرمایا کہ ان کی موت کا ذمہ دار میں خود ہوں کیونکہ میں میٹرک کے امتحان میں تیس دفعہ فیل ہونے کے بعد آخر چوتھی مرتبہ کامیابی حاصل کر لی لی۔ دادا جان نے جب یہ خبر سنی کہ اقبال نے پوری دس جماعتیں پاس کر لی ہیں تو دادا جان یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے اور سوگ باشی ہو گئے۔

باباجی فرمانے لگے کیونکہ خاندان میں میں واحد فرد تھا جس نے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔ اب نامعلوم دادا جان خوشی کے صدمے سے چل بے یا شرمندگی سے کہ اقبال نے یہ کیا گل کھلا دیا ہے کہ اس سے پہلے ہمارے

خاندان میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔

اشرف کے والد صاحب کی صحت بہت اچھی تھی اور کافی چاک و چوبند تھے اور ابھی ان کے مرنے کی عمر نہ تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کو بھی اس طرح کے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ اشرف نے بکرے کو ذبح کرنے سے لے کر گوشت بنانے تک ایک ماہر قصاب کا رول ادا کیا۔ کوہ سارک جو تھار اور اعلیٰ مون کی چوٹیوں پہ سورج کی آخری کرنیں تھر تھرا رہی تھیں جب ہم شاہ بلوط کے جھنڈ میں عارضی چولہا تیار کر چکے تو پوری وادی اندھیرے میں گم ہو چکی تھی۔

چوہدری صدیق نے کہا اشفاق بھائی ہماری میڈیکل کٹ میں بہت سی ادویات ہیں ہمیں تو کل واپس چلے جانا ہے کیوں نہ یہ دوائیاں وادی کے بیمار لوگوں کو دے دی جائیں میں نے کہا بالکل صحیح ہے۔

ہم نے شیر عالم اور دوسرے دوستوں سے کہا کہ وادی میں جو کوئی بھی بیمار لوگ ہیں یا کسی کے چوٹ یا زخم ہے ان سے کہیں کہ ہمارے پاس سے دوائی لے جائیں۔

تھوڑی ہی دیر میں بہت سے مریض آ گئے۔ ڈاکٹر ارشد صاحب نے ان کو دوائی دینا شروع کر دی۔ شاہ بلوط کے جھنڈ میں آگ کاالا دُور رہی سے نظر آ رہا تھا۔ رات بہت پرسکون تھی صرف ندی کے پانی کا شور تھا جو بہت اچھا لگتا تھا۔

شاہ صاحب نے لے میں آ کر پنجابی کی ایک غزل چھیڑ دی

”میرے شوق دا نہیں اعتبار تینوں.....“

وادی کا یہ سکوت ندی کا ترنم شاہ بلوطوں کا خوبصورت جھنڈ اور آگ کاالا و شاہ کی آواز کا سوز اور دور کسی چرواہے کی بانسری سے نکلنے والی مدھرتائیں اور ستاروں بھرا آسمان یہ رات میری زندگی کی خوبصورت راتوں میں سے ایک تھی۔

غزل ختم کرنے کے بعد شاہ صاحب نے ایک عجیب انکشاف کیا۔ کہ جب تم لوگ کوہ سارک جو تھار پہ گئے ہوئے تھے تو میں ہوٹل کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک کیلاش دوشیزہ اپنی گائے لے کر سامنے والے میدان میں آ گئی۔

گائے کو تو اس نے چرنے کے لئے چھوڑ دیا اور خود میری طرف دیکھنے لگی۔

صدیق نے تجسس سے پوچھا پھر کیا ہوا؟

شاہ صاحب فرمانے لگے

پھر میرے قریب آئی اور کہا تم شاہ صاحب ہو؟

میں نے کہا شاہ صاحب آپ کی عقل گھاس چرنے تو نہیں چلی گئی یہاں کی کوئی لڑکی بھی نہ اردو سمجھ سکتی اور نہ بول سکتی ہے۔

شاہ نے کہا میں کیا کہہ سکتا ہوں لیکن اس نے میرا نام لے کر مجھے مخاطب ضرور کیا تھا۔ اشفاق بھائی آج ”تبریک“ میں جو لڑکیاں جشن میں ناچ رہی تھیں وہ تین لڑکیاں ہمارے سامنے ناچ رہی تھیں۔

ان میں جو سب سے خوبصورت تھی وہی لڑکی تھی وہ جشن میں بھی میرے سامنے ہی ناچتی رہی تھی۔

آپ نے دیکھا نہیں وہ کیسے چہک چہک کر مجھے اپنی ادائیں دکھا رہی تھی۔

میں نے کہا شاہ صاحب بکواس بند کریں اور آؤ کھانا کھائیں۔

شاہ نے کہا اچھا آپ کی مرضی آپ یقین کریں یا نہ کریں بہر حال وہ لڑکی مجھ پر عاشق ضرور ہے!

مجھے یقین تھا کہ شاہ کا یہ فرضی فسانہ عشق ہے۔

شیر عالم نے بتایا کہ جب مریض یہاں سے دوائی لے کر جاتے تھے اور دوسرے لوگ ان سے پوچھتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب دوائی والے کہاں ہیں؟ تو دوسرے بتاتے تھے کہ وہاں شاہ بلوط کے جھنڈ میں جو پردیسوں کی بستی ہے دو وہاں سے ملتی ہے۔

کیلائی زبان میں ایسے کمپ فائر کو بستی کہتے ہیں

مجھے یہ نام بہت اچھا لگا

شیر عالم نے بتایا کہ کچھ سال پہلے کیلاش انگریزی دوائی نہیں لیتے تھے۔

بلکہ اپنا علاج خود جڑی بوٹیوں سے کرتے تھے اور اگر کوئی زیادہ بیمار ہوتا تو اسے چار پائی پر ڈال کر شاہ والا پہاڑ کے قریب ایک پہاڑ پر لے جاتے۔

وہاں ایک چشمہ ہے جس سے خون کی طرح کا گاڑھا سرخ پانی قطرہ قطرہ نکلتا رہتا ہے۔ وہاں سے ایک پیالہ پانی مریض کو پلا دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد مریض پاخانہ کرتا ہے جس سے اس کے جسم کی تمام آلائشیں جسم سے خارج ہو جاتیں۔

صبح مریض کو واپس لے آتے ہیں۔

اب بھی زیادہ سیریس قسم کے مریضوں کو وہاں لے جاتے ہیں اور اس گاڑھے خون کی طرح سرخ تازہ پانی کا پیالہ پلاتے ہیں اور مریض ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ لیکن اب جب سے ہسپتال یہاں بنا ہے لوگ انگریزی دوائیاں بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ لیکن

ہسپتال میں دوایاں ہی نہیں ہیں۔

صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور نیچے ہوٹل میں آ گئے۔

اچاؤ

کیلاش ”اچاؤ“ کا تہوار پھل پکنے کی خوشی میں مناتے ہیں اس جشن میں شرکت کے لئے ہمیں خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔

اس سفر میں میرے ساتھ عبدالعلیم اظہر صاحب جو کہ میرے استاد اور بے تکلف دوست ہیں اور رمضان صاحب تھے۔

رمضان صاحب ایک ٹرانسپورٹر ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر حساب کتاب کرنے میں گزار دی اور خود کبھی سفر نہیں کیا۔ یہ ان کی پچاس سالہ زندگی کا پہلا سفر تھا جو کہ شاندا انہوں نے ہمیں بور کرنے کے لئے ہمارے ساتھ کیا۔

جب جیپ ”دوباش“ کے مقام سے ”بمبوریت“ کی جانب مڑی تو رمضان صاحب نے پوچھا کہ ابھی شہر بمبوریت کتنی دور ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ بمبوریت کوئی شہر نہیں ہے۔ ندی کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر صرف چند پسماندہ قسم کے گاؤں ہیں اور ان کو ہی وادی بمبوریت کہا جاتا ہے۔

رمضان صاحب نے پوچھا کہ پھر یہاں آنے کا فائدہ؟

اگر صرف یہ پہاڑ وغیرہ ہی دیکھنا تھے تو یہ پنڈی کے قریب کیا کم تھے جو اتنی دور چلے آئے؟

دراصل میرے بڑے بھائی جان نے میری آوارگی کے قصے ان صاحب کا شاید کچھ زیادہ ہی مبالغہ آمیزی سے سنائے تھے کہ یہ بھند ہوئے کہ وادی کیلاش کے آئندہ سفر میں ان کو بھی ساتھ لے لیا جائے۔

برون گاؤں میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ شیر عالم اور دوسرے دوست ”وادی رمبور“ گئے ہوئے ہیں کیونکہ وہاں ان کی ایک رشتہ دار انتقال کر گئی ہے اور وہ لوگ اس کی آخری رسوم میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے۔

کیلاش ہوٹل میں کمرہ لیا اور رات کے کھانے کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ صرف چپاتی اور دال ہی مل سکتی ہے کھانا آیا تو رمضان صاحب نے پوچھا کہ بس یہی کچھ ہے؟

بھئی گوجرانوالہ کی کیا بات ہے!

علیم صاحب اگر آپ اس وقت گوجرانوالہ میں میرے ساتھ ہوتے تو کھانے کا مزہ آ جاتا۔

واہ جی واہ!

مرغ مسلم بائی گوشت چڑے اور بٹیرے اور ساتھ میں روغنی نان!
کیا بات ہے گوجرانوالہ کی!

رمضان صاحب نے فرمایا کہ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ لوگ مجھے اس جنگل میں لے کر آئیں گے۔ اگر معلوم ہوتا تو میں گوجرانوالہ ہی میں اتر جاتا۔

اور اس وقت میں یہ سوکھی روٹی نہ چبا رہا ہوتا۔

رمضان نے بیرے سے کہا کہ لیموں لے کر آؤ۔

بیرے نے کہا یہ لیموں ادھر نہیں ہوتا ناں!

صبح سویرے ہی شیر عالم رحمت رحیم اور دوسرے دوست آگئے ان کے ساتھ ناشتہ کیا۔ ناشتہ کے ساتھ قبوہ بھی تھا۔

رمضان صاحب نے شیر عالم سے لیموں کی فرمائش کی۔ شیر عالم نے بتایا کہ لیموں ادھر سے نہیں ملتا۔

ہم ان دوستوں کے ساتھ وادی کی سیر کو نکل گئے۔

شیر عالم جب کسی گھر میں ہمیں لے کر جاتا تو وہاں لڑکیاں شیر عالم کا ہاتھ چوم کر آنکھوں کو لگاتیں۔ کیلاشوں میں یہ رسم ہے کہ عورتیں اپنے رشتے داروں سے جب کئی دن بعد ملتی ہیں تو اس کے ہاتھ کو چوم کر آنکھوں کو لگاتی ہیں اور مرد ایک دوسرے سے شپا تا کرتے ہیں۔

رمضان صاحب ان کی یہ حرکتیں نوٹ کرتے رہے۔

اور واپس آ کر میرے بڑے بھائی جان سے شکایت کی کہ اشفاق ادھر سیر وغیرہ کے لئے نہیں جاتا بلکہ اس کا ادھر کوئی ”چکر“ وغیرہ

ہے۔

بقول رمضان صاحب ادھر نہ کوئی بڑا شہر ہے اور نہ ہی سیر کے لئے کوئی معقول جگہ ہے۔

رمضان کو فطری مناظر ندیوں، چشموں اور برف پوش پہاڑوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ان کو صرف اچھا کھانا اور کوئی بہت بڑا شہر دیکھنے کی حسرت تھی جو کم از کم ہمارے ساتھ پوری نہ ہو سکتی تھی۔

وادی کا چکر لگانے کے بعد جب شیر عالم کے گھر سے ہمارے لئے چائے آئی تو رمضان صاحب نے شیر عالم سے پوچھا کہ لیموں

نہیں مل سکتا؟

شیر عالم نے کہا آپ کو بتایا ناں ادھر نہیں ہوتا۔

رمضان صاحب کہنے لگے یا رکس جگہ لے آئے ہو؟ کہ ادھر لیموں بھی نہیں ہے۔ تم تو کہتے تھے ادھر ہر قسم کا فروٹ ہے اور ہاں وہ جو تم کہہ رہے تھے کہ ادھر وادی میں کوئی جشن وغیرہ ہے۔ وہ کہاں ہے؟

میں نے کہا بھائی جان کیلاشوں کے جشن کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ان دنوں جوان کا جشن ہے اس کا نام اچاؤ ہے اور ان کا یہ جشن رات کو ہوتا ہے۔ یہ جشن پھل پکنے کی خوشی میں منایا جاتا ہے کیونکہ کیلاشوں کے پاس فصلیں بونے کے لئے زمینیں بہت تھوڑی تھوڑی ہیں۔ اس لئے انگور، ناشپاتی، سیب اور اخروٹ اناج کے بعد ان کی بڑی فصلیں ہیں۔

یہ اپنے پھلوں کو چھوٹے چھوٹے سٹوروں میں محفوظ کر لیتے ہیں اور پھر سارا سال ان پھلوں کو کھاتے ہیں یہ پھل ان سٹوروں میں پڑے ہوئے سارا سال بالکل تروتازہ رہتے ہیں۔ جشن اچاؤ وسط اگست میں منایا جاتا ہے جب کہ تمام پھل پک کر تیار ہو جاتے ہیں جشن سے پہلے پھلوں کو توڑنا منع ہے۔ جشن سے ایک دن پہلے اجتماعی طور پر ان پھلوں کو توڑ کر محفوظ کر لیا جاتا ہے اور پھر ایک دوسرے کے گھر پہ پھل تحفے کے طور پر بھی بھیجے جاتے ہیں۔ ان پھلوں میں انگور سب سے زیادہ ہوتے ہیں اس لئے آدھے پھلوں کو سٹور میں رکھ دیا جاتا ہے اور آدھے انگوروں سے پانی نکال کر چمڑے کے مشکیڑوں میں محفوظ کر لیا جاتا ہے یہ پانی ان مشکیڑوں میں پڑا کچھ دنوں کے بعد تھوڑا سا کڑوا ہو جاتا ہے۔

اس کو کیلاشی زبان میں ”ڈھا“ کہتے ہیں اور پھر اس مشروب کو کیلاش اپنے تہواروں میں پیتے ہیں۔

ہم رحمت رحیم کے مہمان خانے میں بیٹھے قبوہ پی رہے تھے اور رمضان صاحب لیموں نہ ملنے کی شکایت کر رہے تھے۔

اوپر کے قریب جو چھوٹا سا میدان ہے وہاں ڈھول بجنا شروع ہو گیا میں نے علیم صاحب اور رمضان سے کہا کہ آؤ اوپر چلیں کیونکہ اچاؤ کے تہوار کے لئے رقص وہاں مانوش کے قریب ہی کیا جاتا ہے لیکن علیم صاحب اور رمضان نے میرے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ وادی کی سیر سے بہت زیادہ تھک چکے تھے اور یہاں سے مانوش کے قریب والے میدان کا فاصلہ تقریباً دو کلومیٹر عمودی چڑھائی کی شکل میں تھا۔

شیر عالم کے ساتھ جب میں میدان میں پہنچا تو خوب ہنگامہ برپا تھا دونو جوان گلے میں ڈھول ڈالے بے ہنگم طریقے سے پیٹ رہے تھے اور ایک نوجوان شہنائی کی طرح کا کوئی ساز منہ سے بجا رہا تھا گاؤں کی تقریباً تمام آبادی یہاں جمع تھی کیلاش بڑی بوڑھیاں

ادیٹر عمر جوان اور نو جوان لڑکیاں اور چھوٹی عمر کی بچیاں ایک بڑے دائرے کی صورت میں ناچ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اونچی آواز سے کچھ گا بھی رہی تھیں جو کہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

شیر عالم نے اس کا ترجمہ کچھ یوں کیا۔

اے خدا ہم تیرے شکر گزار ہیں

کہ تو نے موسم بہار لا کر اور پھر

گرمی کا موسم لا کر ہمارے پھلوں

کو دھوپ کی گرمی سے رنگ تبدیل کر کے پکایا

اے محبوب تو بھی پہاڑوں سے واپس آ جا

کہ تمام پھل پک چکے ہیں

تو ان کو کھا کر اپنی صحت کو مزید بہتر کر لے

اور میری بانہوں میں آ کر انگور کا پانی

پی اور مد ہوش ہو جا

رات گئے رقص ختم ہوا تو میں واپس ہوا رمضان صاحب نے پوچھا کہ جشن کیسا تھا۔

میں ان کو بتایا کہ رقص اندھیرے میں کیا گیا ہے اور رسم ہے کہ اس جشن میں روشنی نہیں کی جاتی، تمام رسمیں اندھیرے ہی میں ادا کی جاتی ہیں۔

رمضان صاحب نے کہا کہ بہت اچھا ہوا، ہم نہیں گئے۔ بھلا ایسا رقص دیکھنے کا کیا فائدہ جو اندھیرے میں کیا جاتا ہے۔

علیم صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ اگر سفر میں سگت اچھی نہ ہو تو پھر سفر ”سفر“ بن جاتا ہے۔

رمضان صاحب کو لیموں کی تلاش تھی اس لئے دوسرے دن واپس آ گئے۔ جب پشاور پہنچے تو رمضان صاحب نے سب سے پہلے پاؤ بھر لیموں خریدے اور ایک قبوہ خانے میں لے گئے۔

اور فرمانے لگے اب مزہ آئے گا۔ قبوہ آیا رمضان صاحب نے ایک ایک لیموں ایک ایک پیالی میں نچوڑ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سنہری قبوے کی صورت بے رنگ پانی میں بدل گئی۔

رمضان صاحب کہنے لگے یہ کیا ہوا؟ میں نے اور علیم صاحب نے کہا آپ کو لیموں مل گیا اور ستیانہ فیصل آباد سے لے کر اتنا طویل سفر جو کہ ہم نے خوشگوار اور حسین وادیوں کے مناظر دیکھنے کے لئے کیا تھا صرف تین دن میں انجام پذیر ہوا اور اس کی بدمزگی زندگی بھر ہمارے دلوں سے محو نہ ہو سکے گی۔ واپسی پشاور سے فیصل آباد تک کے سفر کی داستان سنانے کے قابل نہیں ہے۔ اور پڑھنے والے بھی اس کو سننے کے لئے عمر بھر ترستے رہیں تو بہتر ہوگا۔

